فلکش

ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جو ملک کے مقتدر
رسالوں میں شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں،

از

سید ابوطاہر

بی۔ ایس سی (لک)، بی۔ ٹی (بمبئی)

گورنمنٹ اردو ٹریننگ کالج ۔ پونا

ناشر

امپیریل بک ڈپو لکھنؤ

۱۹۳۸ء

بار اوّل

فہرست مضامین

سید علی رشیدی ایم۔ اے نے عالمگیر
الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم صاحب پرنٹر
چھپوا کر لکھنؤ سے شایع کیا۔

حضرت

۱

لندن کی گوبرڈک سٹریٹ ناکام اور کس مپرس ادیبوں کیلئے مشہور تھی۔ جن میں سیموئیل جانسن کی عظیم الشان شخصیت بھی شامل تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان میں ان خصوصیات کی حامل ایسی کون سی سڑک ہو سکتی ہے جس میں جانسن ایسی بزرگ ہستیاں قعر گمنامی کی تاریکیوں میں ادب اردو کے آسمان پر طلوع ہونے کے لیے محفوظ کر دی گئی ہیں اور وقت معینہ کا انتظار کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ مستقبل قریب کے اس آفتاب صحافت کے سامنے کتنے ٹمٹماتے ہوئے چراغ اور کتنے جھلملاتے ہوئے تارے خود کی روشنی کو قائم رکھ سکینگے۔ تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ مرگ صد ہزار انجم ہی سے سحر کی پیدائش ہوتی ہے۔ بہرحال چونکہ "ہنوز دلی دور است" اس لیے ہم اپنے قلم کی جولانی کو موجودہ صورت حالات ہی تک محدود رکھینگے اور آپ کی طبع نازک پر آئندہ کیا ہوگا؟ کے خیالی پروگرام سے بار ڈالنے کی کوشش نہیں کرینگے۔

قدما کا ایک نظریہ تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے مگر اس کو خدائے سخن حضرت انیس مرحوم کی طلاقت بیانی نے غلط ثابت کر دیا۔ اسی طرح موجودہ دور میں بعض نقادان ادب کا خیال ہے کہ بیکار گریجویٹ مضمون نگار بن جاتے ہیں۔ ہم کو اس سے بھی اختلاف ہے۔

دراصل دنیا میں مشکل ترین پیشہ کاشتکاری کا قرار دیا گیا ہے جس میں غریب کسان کو سراپا قناعت بن کر اپنی ہستی اور اپنے خرمن کو عناصر قدرت کے رحم و کرم کے سپرد کر دینا پڑتا ہے لیکن ہم اپنی ذاتی رائے کی بنا پر کاشتکاری کو صرف مشکل پیشہ تسلیم کریں گے اور مضمون نگاری کو مشکل ترین۔ اس فضیلت کی وجہ یہی ہے کہ موخر الذکر کو عناصر ادب کی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بننا پڑتا ہے۔ جس کا نظام قدرت کے نظام کی طرح اٹل اور کسی خاص اصول کے ماتحت نہیں ہوتا۔ ہم اس حد تک کہنے کیلئے تیار ہیں کہ "قناعت" جو کاشتکاری کا طرۂ امتیاز خیال کی جاتی ہے مضمون نگاری کی قناعت کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں۔ علاوہ بریں اخلاق حسنہ کا مجسمہ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اسے اردو کے مضمون نگاروں اور ادیبوں میں تلاش کرنا چاہئیے یہی سبب ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اکثر اجارہ دار اس خاص شاہراہ عمل پہ گامزن ہیں تاکہ اس میدان میں اخلاق حمیدہ کی تجلیاں قائم رہ سکیں۔

ہم نے مضمون نگاروں کیلئے اردو زبان کی قید اس لئے لگادی ہے کہ مقابلتاً اس زبان میں کوئی ایسی خصوصیت اور جاذبیت موجود نہیں جو ایسے بے نفس اور غیر طامع کارکنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ دراصل موجودہ صورت حالات کے ماتحت اس پر خامہ فرسائی کرنا گویا صحرائے افریقہ کی تپتی اور سلگتی ہوئی زمین پہ ہل چلانا ہے۔ وہ لوگ قابل مبارکباد ہیں جو اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس سراب میں جادہ پیمائی کر رہے ہیں ورنہ اس کی آخری منزل تک پہونچنا حاتم طائی کے دل گردہ کا کام ہے

جس نے حسن بانو کے سات سوالوں کا جواب دریافت کیا تھا۔ نوآموزوں کیلئے بی۔ اے کی ڈگری سے کسی طرح کم نہیں جو حاصل ہونے سے قبل تمناؤں کی مخزن اور مل جانے کے بعد تمناؤں کی مدفن ہوتی ہے۔

واقعی رسالوں کی بنجر زمین پر جکیمانہ نکتوں کی تخم ریزی اور اجارہ داران ادب کی سرد مہری، نقادانِ ادب کی طوفان خیز اور تباہ کن ژالہ باری اور پبلک کے مذاق کی خشکی بحیثیت مجموعی اردو کے مضمون نگاروں کی جولانی طبع کے لئے مہلک جراثیم ثابت ہوتی ہیں اور اس کا حشر بھی وہی ہوتا ہے جو خشک سالی کے دوران میں تازہ بتازہ نو بہ نو بیج کا۔

عناصر ادب کی متذکرہ بالا ستم ظریفیوں کے علاوہ ایک غریب مضمون نگار کو اس سلسلہ میں وقت، دماغ اور ڈاکخانہ کے ٹکٹوں کا ایسا مسلسل سرمایہ لگانا پڑتا ہے جو میرے خیال میں کسی متحدہ کمپنی کو نیلگری اور آسام کی بنجر پہاڑیوں پر چائے کی کاشت کرنے یا بمبئی کی پبلک کو روئی کے نمبروں میں بھی نہ لگانا پڑتا ہوگا۔ البتہ اس کے منافع میں پرچے اور رسالے کثرت سے آتے ہیں جن کو دیکھ کر اکثر سیکنڈ ہینڈ کتب (استعمالی کتابیں) کی دوکان کھولنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں ایڈیٹروں کی طرف سے عزت افزائی کے خطوط بھی ہوتے ہیں جو بعینہ وہی درجہ رکھتے ہیں جو ڈپٹی کمشنر بہادر کے سرٹیفکیٹ ایک اس زمیندار کے حق میں جس نے جنگ عظیم میں بہادر اور لڑاکو کسانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی ہو یا کانگریس کے زمانے

ہیں الکحل کے نیلام میں بولی بڑھانے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہو۔

اسی ضمن میں ایک طویل امیدواری کے بعد ایک خطاب البتہ عطا ہوتا ہے، جو "حضرت" کے نام پر مشتمل ہے اور جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے۔ ہم اس لفظ کی تاریخ پر کسی قسم کا تبصرہ تو نہیں کر سکتے۔ ہاں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چند سال قبل تک یہ پیغمبرانِ عظام اور اولیائے کرام کی واحد ملکیت خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اسی خیال کی بنا پر ہماری محترمہ نے ایک روز ایک رسالہ کی ورق گردانی کے بعد ضمناً ہم سے ارشاد فرمایا تھا کہ "اگر میں ایڈیٹر ہوتی تو حضرت کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کا اور اضافہ کرتی۔" جس کو سن کر ہم نے بیساختہ کہا تھا کہ "خدا نہ کرے۔" بہرحال ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا یہ ارادہ کہاں تک واجب التسلیم اور حق بجانب تھا۔ اسی سلسلہ میں اگر نسوانی رسالوں کی مضمون نگار محترمات کے نام کی کلغی کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو حضرت کا ہم پلہ ہے اور "آنسہ" پر مشتمل ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ ہم باوجود عرق ریزی کے یہ پتہ لگانے میں ناکام رہے کہ آیا یہ ایڈیٹروں کی طرف سے اضافہ ہے یا خود مضمون نگاروں کی جدت، اگر ایسا ہے تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ کن حقوق کی بنا پر؟

۲

ہمارے رشحاتِ قلم کا اصل مقصد ان نوآموز ادیبوں کو فائدہ پہنچانے کا ہے جو اس میدان میں گامزن ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں ہم یہ بھی نوٹ کرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مقالات فی الواقعی پارلیمنٹ کے اربابِ حل وعقد کی گوہر افشانیوں

کی طرح تذکرۂ ہوتے ہیں واقفیت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری نوکِ قلم سے کاغذ میں چھید نہیں ہوتے۔

نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ غریب مضمون نگار دو عظیم چکّی کے پاٹوں کے بیچ میں اپنی ادبی زندگی گذارتا ہے جن میں سے ایک پاٹ ایڈیٹر ہیں اور دوسرا پبلک۔

اکبر کے قول کے مطابق بیوی راضی رہیں اور کلکٹر صاحب اور ہمارے مشورے کی رو سے پبلک راضی رہے اور ایڈیٹر صاحب، اس لئے بہتر ہوگا کہ "حضرت" جو ایک ادیب کیلئے معراجِ ادب ہے، اس کے حصول کے لئے ہم سب سے اول ایڈیٹروں کا تجزیۂ نفس کریں تاکہ ہم ان کی ہمدردی اسی طرح حاصل کرلیں جس طرح خان بہادری کے امیدوار حکامِ بالادست کی نگاہِ کرم کو اپنی طرف منعطف کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ امر چنداں دشوار بھی نہیں ہے کیونکہ ایڈیٹر بھی اسی مادہ سے مرکب ہیں جو فرشتوں کے بنیادی مادے سے کسی حد تک مختلف ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ میرا روئے سخن ان مضمون نگاروں کی طرف نہیں ہے جو "ایں سعادت بزورِ بازو نیست" کے مصداق ہیں۔

مضمون نگار اور ایڈیٹر کا تعلق بعینہٖ وہی ہے جو ایک مزدور اور سرمایہ دار میں اسی لئے ذیل کے اصول میں نے اپنے ایک نئی چھاپ کے خان بہادر دوست کے مشورے سے قائم کئے ہیں جو بحیثیت خود "حضرت" کے امیدواروں کے لئے ایک

مستقل دستور العمل کا کام دینگے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بہمہ وجوہ مکمل ہیں۔ ممکن ہے کہ ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پڑے جس کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں۔

سردست ان کی تعداد صرف چھ ہے اس لئے مہربانی فرما کر ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے شمار کیجیئے۔ اوّل قرابت، دوئم درخواست، سوم تحریک چہارم سفارش، پنجم رشوت اور ششم جسارت۔

اب ان عنوانات کی تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "قرابت"، دفتر کے بڑے بابو جی کی قرابت حصول ملازمت کی سنہری کنجی ہے اسی اصول کے ماتحت ایڈیٹر کی ذات والاصفات سے توسل ایک مضمون نگار کیلئے بہترین فضیلت ہے اس سعادت سے جو ہستیاں محروم ہوں ان کو چاہیئے کہ دفتر کے کاتب سے رجوع کریں جو بیک گردش قلم ان کو ادیبوں کا تاجدار بنا سکتا ہے یہ ہنگامی فضیلت رسالے کے دوسرے نمبروں میں روایتاً اور رسماً ایک مستقل حیثیت اختیار کرلیگی جس کو ایڈیٹر کی نوک قلم بھی نہیں مٹا سکتی۔

(۲) "درخواست"۔ مخلصانہ خدمت کے ضمن میں ہر صبح کی ڈاک سے ایک مضمون کی بلاناغہ روانگی تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ یہ نوٹ کرلیجیئے کہ مضامین کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہوں جن میں اصل مصنف کا نام لکھنا اور اس کے تحت میں ماخوذ تحریر کرنا ایک ادبی غلطی ہے۔

(۳) "تحریک" کسی رسالے کے چند ناظرین کے پراثر خطوط، ایک مضمون نگار کی

قابلیت اور حق کو پایہ ثبوت تک پہونچا دیتے ہیں، ہاں البتہ ایسے خطوط کے ٹکٹ
کی ذمہ داری خود امیدوار کے سر پر اخلاقاً عاید ہوتی ہے۔"

(۴) "سفارش" تحریک اور سفارش میں وہی فرق ہے جو "تم" اور "تو" میں ہے
اول الذکر میں زور ہے اور آخر الذکر میں بیچارگی۔ بہرحال اس مقصد کیلئے کسی رحمدل
نقاد کی خدمات آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۵) "رشوت" درخواست اور رشوت بھی دو جداگانہ حیثیتیں رکھتی ہیں۔ پہلی
ٹھکرائی جا سکتی ہے لیکن آخری شکریہ کے ساتھ قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ ان دونوں
صورتوں کا نازک اور باریک فرق دراصل کچہری کے کارکنوں اور پولیس افسروں
کی لین دین میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کسی رسالہ کی اشاعت میں ترقی دینا اور
اس کا پروپگنڈا کرنا دراصل ایک قسم کی رشوت ہی تو ہے۔ سول ایجینسی اس کی بہترین صورت ہے

(۶) "جسارت" چونکہ "حضرت" کا کاپی رائٹ محفوظ نہیں اس لئے ہر شخص کو
اختیار ہے کہ وہ اس لفظ کو اپنے نام کا جزو لاینفک قرار دے دے اور ایڈیٹر کو مجبور کرے
کہ رسالہ میں اس کی اصل کی نقل تحریر کرے۔ چنانچہ اگر کسی کو اعتراض ہو تو اس کے سامنے
سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کا نام نامی پیش کیا جا سکتا ہے جو دراصل ہیں تو ذات واحد
لیکن ڈبل شخصیتوں کے حامل ہیں اور چند ماہ قبل تک ہم ان صاحب کو صاحبان خیال
کرتے تھے اسی ضمن میں حکیم، مولوی، حاجی، خادم کعبہ اور سید وغیرہ بھی آسکتے ہیں جن کے
محل استعمال اور حق ملکیت پر کوئی اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

۳

حضرت کا خطاب ایک پرانی وضع کا انجن ہے جس کو چالو رکھنے کیلئے مضمونوں کا ایندھن مسلسل پہونچنا چاہیئے اس مقام پر پہونچکر مضمون نگار ایک ٹائپ رائٹر بنجاتا ہے جس کی کھڑکھڑ سے عاجز آکر سوختہ دل بیوی ہندوستان میں میکہ بساتی ہے اور انگلستان میں ہمسایہ اور وہ خود ڈی کوئینسی کی طرح افیون کی گولی سے شناسائی پیدا کر کے مکمل "ادب" بن جاتا ہے۔

ایک عرصہ کے بعد رسالہ کے فرمائشی خطوط اس کے لئے وارنٹ بن جاتے ہیں اور اس کی شخصیت اس سید کی طرح جسے افغانی پٹھان تبرکاً پارہ پارہ کر کے مزار بنانے کے کام میں لاتے ہیں ہر طرف سے لاؤ لاؤ کی صدا بلند ہوتی ہے اس وقت وہ ایک گاندھی صفت شوہر ہوتا ہے اور رسالوں کی متحدہ فوج اس کی سسرال جس کے خزانہ میں اس کے دماغ کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں لیکن نہ تو بجٹ پورا ہوتا ہے اور نہ "ہل من مزید" کی صداؤں میں کمی۔

آخر کار ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ اس کی آنکھیں عینک کے شیشوں میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ اس کے پاؤں کی قوت سلب ہو کر ہاتھوں کی انگلیوں میں صعود کر آتی ہے اس کا دماغ قلم کی نوک میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کا معدہ دوات کے پیٹ میں جنم لیتا ہے۔ رسالے اس کا بستر، کاغذ اس کا لحاف، مضامین اس کے خواب اور خواب اس کی زندگی، وہ انسان نہیں رہتا بلکہ یہ مادی جسم بتدریج فنا ہو کر لطیف تر بنتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سر پر لے دے کے ایک خول رہ جاتا ہے۔ کھوکھلا

جس پر اتنے ہی بال باقی رہتے ہیں جتنے انڈے کے سر پر، شاعروں کے معشوق کی طرح جس کے کمر ہوتی ہی نہیں۔ وہ اپنی جسامت سے بے نیاز ہو کر رسالوں کے انبوہ کثیر میں آخر کار اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ خود بھی کسی رسالے کا حسین سرورق معلوم ہونے لگتا ہے مرنے کے بعد یہ خیالی پیکر آواگون کے سخت امتحانوں سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ بھیجا بھی جاتا ہے تو کتابوں کے کیڑوں کی شکل میں۔

یقیناً ایک مضمون نگار کا انجام عبرتناک ہے اس لئے اگر حضرت بننے کی بعد رحمتہ اللہ علیہ بنا منظور نہیں تو اپنی ذات میں ایسے کیمیاوی تغیرات پیدا کرنے چاہئیں کہ ذیل کے مرکبات میں سے کسی ایک شکل میں تبدیل ہو جائے۔ اکسیر بننے کیلئے رسالوں کی بھٹی سے تقریباً قطع تعلق کرنا پڑیگا اور خود کو پبلک کے "سیال مذاق" میں پے درپے بجھاؤ دینا پڑینگے۔ فی الحال صرف چار مرکبات ہی تجویز کئے جاتے ہیں آئندہ حسب ضرورت دوسری تدابیر پر بھی غور کیا جائیگا۔ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ مجرب المجرب ہیں اور تیر بہدف،

(۱) اڈیٹری (۲) پروفیسری (۳) رومانیت (۴) تصنیف و تالیف

چونکہ عنوانات بحیثیت خود اپنے مطلب کو آشکارا کر رہے ہیں اس لئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں،

۴

اب رہا پبلک کا مسئلہ، اس کے متعلق ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک مذاق فن کا تعلق ہے پبلک اس سے قطعاً معرا ہے، عوام اور مذاق صحیح دو متضاد اشیا ہیں

جن کا یکجا کرنا کسی سیدھے خط کے دو سروں کو ملانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے دلوں پر حکومت کرنے کیلئے پروپگنڈا کے طلسمی اور ہوائی قلعے کی ضرورت ہے، جس کی تعمیر دوسرے معنوں میں خود کو طلسم میں بند کر لینا ہے جہاں سوائے صاحبقران ادب کے دوسرے ساحروں کی دسترس سے ایک ادیب ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

(ہوا کاری) پروپگنڈا کی خشت اُپج کے مصالحہ سے مضبوط ہوتی ہے اور اُپج، واقعی دماغی قلابازی کی ایک بہترین صورت ہے جو پبلک کے لئے ضیافت طبع کا کام دیتی ہے اور عامتہ الناس کی زندگی کی کٹھن گھڑیوں کو چند لمحوں کے لئے دلچسپ بنا دیتی ہے مگر کارآمد نہیں کیونکہ وہ اُپج ہی نہیں جو عمل کے دائرہ میں محدود ہو جائے ایسے ہوا کار کا دماغی توازن ایڑی میں آجاتا ہے اور اس کے تلوے پبلک کے سروں پر قائم ہو جاتے ہیں اگر وہ چاہے تو جوتے پہن کر بھی لوگوں کی آنکھوں میں درآنہ داخل ہو سکتا ہے

ڈارون کی اُپج مسئلہ ارتقا تھی جس کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے۔ سر آلورلاج اور سر آرتھر کانن ڈائیل کی اپج روحانیات ہے، جارج برنارڈ شا کی اُپج دماغی سنک اور یہی ان لوگوں کی ہستی کو مافوق الفطرت شخصیت بنانے کی ذمہ دار ہے۔

ہندوستان کی سرزمین پر جسمانی نٹ بہت پیدا ہوتے ہیں لیکن دماغی نٹ کم، البتہ سر رابندر ناتھ ٹاگور اور گاندھی جی نے اس زمانہ میں اس قسم کے سرکس کی بنیاد رکھی ہے جس کو پایہ تکمیل تک پہونچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے پرواز خیال کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے جس کے

مقابلہ میں یورپ کا میدان تنگ ہو چکا ہے۔ ہمارے یہاں پنجاب کی سرزمین خصوصیت سے پیغمبری کی پیداوار کیلئے زرخیز واقع ہوئی ہے اور بنگال کی دہشت انگیزی کیلئے اس کے علاوہ اُپج کی دوسری صورتیں بھی ہیں مگر غور وفکر شرط ہے مثلاً کسی ہندوستانی اولوالعزم نوجوان کا ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے کا صرف نوٹس دینا اور چند ماہ بعد قطب مینار کے عرشہ پر بیٹھ کر سائنس کا ایک رومان تصنیف کر دینا۔ یا خود کو بہادر شاہ مرحوم کا دوسرا چولا ثابت کرنا اور دہلی کے تخت و تاج کے لئے پارلیمنٹ میں دعویٰ کرنا۔ تصویریں اخباروں کو دینا، ملاقاتیں رپورٹروں سے کرنا اور روئداد مقدمہ لکھکر روپیہ اور شہرت پبلک سے لینا مشکل مرحلے نہیں

اُپج کی بعض صورتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ دنیا کا پیدل سفر اب بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں کیونکہ ہر مہذب ملک میں گداگری کے خلاف قانون بننے والے ہیں۔ رہ گیا سینما کی ایکٹنگ کا خیال تو سردست وہ بھی محال ہے کیونکہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی ڈائرکٹر عمر پٹہ لکھا کر آئے ہیں۔



اسی سلسلے میں ایک حکایت بھی سن لیجئے۔ ہمارے ایک دوست حضرت بن جانے کے بعد صاحب تصنیف بھی بن گئے جو عین فطرت ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد اکثر صاحب اولاد ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی عین فطرت ہے مگر دونوں میں لیاقت درکار ہے۔ کتاب شائع ہو جانے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خود کو مشتہر کیا

جائے یا کتاب کو۔ یہی مرحلہ ہمارے دوست کو بھی درپیش ہوا اور انھوں نے میری رائے دریافت کی۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ کسی رسالہ یا اخبار میں "ضرورت ہے" کے عنوان سے اپنی شادی کا اشتہار دیجیئے جس میں اپنی لیاقت، قابلیت، شرافت اور دولت کا مبالغہ آمیز تذکرہ ہو اور لڑکیوں کیلئے عمر، حسن، دولت، شرافت، تہذیب، تعلیم، مذہب اور قومیت میں سے کسی چیز کی قید نہ لگائی جائے البتہ یہ شرط ضروری ہو کہ ہر امیدوار کو کتاب مذکورہ کی ایک کاپی نقد دام سے خرید کر اپنے حالات و ضروری اطلاعات اس کے سرورق پر لکھ کر بھیجنا چاہئیں ورنہ درخواست پر کسی قسم کی توجہ نہ کیجائیگی۔ چونکہ ہندوستان جنت نشان میں لڑکیوں کی کافی تعداد مدفاضل میں ہے اس لئے مجھکو یقین واثق تھا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ مگر بدقسمتی سے ان کی شادی ہو چکی تھی اس لئے وہ اس تجویز پر عمل نہ کر سکے۔

مجبوراً انھوں نے حسب دستور اپنے پہلے شاہکار کو ایک ایڈیٹر کے معاینہ کے لئے روانہ کر دیا اور بس۔ ایڈیٹر کا فرض منصبی تنقید کرنا ہے اور اس نے میرے خیال کے مطابق تنقید کی۔ دراصل کتاب اس کی مستحق ہی تھی۔ ادبی غلطیاں، پلاٹ کی خامیاں، صرف و نحو کی گستاخیاں اور خیالات کی ہرزہ سرائیاں ریویو کے صفحہ پر اس کثرت سے بیان کی گئی تھیں کہ کتاب اور مصنف دونوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور دونوں ہمیشہ کے لئے قعر گمنامی میں ڈھکیل دیئے گئے۔

چند روز بعد وہ میرے پاس اس طرح تشریف لائے جس طرح مسٹر کسا کا

ناکام طالب علم، میں نے ازراہ ہمدردی ان کو تلقین صبر کی اور ان کو یقین دلایا کہ اس دنیائے فانی میں اگر آپ کے صحیفے کی قدر نہیں کی گئی تو کوئی غم نہیں انشاءاللہ دوسری دنیا میں آپ کی کتاب بیحد مقبول ہوگی اور ہر حور و غلماں کے ہاتھ میں اس کی ایک ایک کاپی ضرور بالضرور ہوگی۔ لاریب یہی طریقہ ہے نیک مصنفین کو اجر و ثواب عطا کرنے کا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ انھوں نے مجھے "عاقبت کی خبر خدا جانے" کہکر خاموش کر دیا اور اس کے بعد مجبور کرنے لگے کہ میں ان کو ایڈیٹر مذکور کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے میں مدد دوں کیونکہ میرے کرم فرماؤں میں کئی سربرآوردہ بیرسٹر اور وکیل بھی ہیں مجھ کو ان کی اس ناعاقبت اندیشی پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی لیکن میں نے ایک کو ظاہر کر دیا اور دوسرے کو پی گیا۔

آخرش میں نے پھر آنچ کی لی، دوسرے روز انھوں نے میرے حسب مشورہ اپنے والد مرحوم کی طرف سے ایڈیٹر مذکور کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں خود کی ناگہانی موت کی اندوہناک خبر مندرج تھی۔ وجہ موت یہ ظاہر کی گئی تھی کہ مرحوم نے ادبی خدمت پر تندرستی کو قربان کر دیا تھا۔ کتاب پر غلط اور خلاف امید تنقید سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوئی۔ مرتے وقت ایڈیٹروں کا کلمہ ورد زبان تھا اور کتاب زیر بحث سینہ پر تھی۔ آخر میں مرحوم کی حسب وصیت کتاب کا حق تصنیف و تالیف محترم ایڈیٹر کے نام بخش دیا گیا تھا۔

ناممکن تھا کہ ایک ادیب کی حسرتناک موت پر ایڈیٹر کا دل نہ پسیجتا۔ رسالے کے دوسرے نمبر میں ہی تحریر تھا جس کی میں پیشینگوئی کر چکا تھا۔ سیاہ حاشیوں کے درمیان "اردو ادب کا سوگ" ایک عنوان تھا جس کے نیچے ادیب لبیب حضرت ...... مصنف ...... کی مرگ ناگہانی پر اظہار گریہ و بکا کیا گیا تھا۔ رسالوں پر آپ کے رشحات قلم کے احسانات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس سانحہ عظیم سے ادب اردو کی حسرتوں کا خون ہوا تھا اور جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا اس پر نالہ وماتم کیا گیا تھا آخر میں ان کی یادگار منانے کیلئے رسالے کا ایک خاص نمبر نکالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ریویو کے صفحہ پر خاص طور سے ان کی بیک وقت بیوہ اور یتیم کتاب پر دست شفقت پھیرتے ہوئے گذشتہ نمبر کی تمام تنقید کا اس خوبصورتی سے ابطال کیا تھا کہ میں ایڈیٹر کی منصف مزاجی اور دیانت داری کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی نہیں بلکہ اس "استفراغ ادب" کو "روح ادب" کے نام سے تعبیر کیا تھا اور رسالے کے محترم ناظرین سے پرزور اپیل کی گئی تھی کہ اگر بد قسمت ادب کی خاطر نہ سہی تو مرحوم کی روح کو ایصال ثواب ہی کی غرض سے ایک ایک جلد ضرور خریدنا چاہیئے۔

میں نے ریویو کے اس لاثانی نمونے کو پڑھ کر اپنے دوست کو زندۂ جاوید ہستی بن جانے پر مبارکباد دی۔ اس تحریک کا یہاں تک نتیجہ ہوا کہ میں خود بھی ایڈیٹر کی قلم کی روانی کے ساتھ بہہ گیا۔ اور آئندہ سے ان کو ادیب ماننے لگا۔ اور ان کی کتاب کو ادب۔ چنانچہ جب دوبارہ میں نے اسی کتاب کو لیکر پڑھا تو مجھ پر واقعی وجد کا عالم

طاری ہوگیا گویا وہ کتاب طلسم ہوشربا بن گئی تھی۔ یہ جادو اور طلسم نہ تھا تو اور کیا تھا۔

موت کامیابی کی ایک سنہری کنجی ہے۔ جس طرح بادل کے آنچلوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی اپنی اصلی جسامت اور بلندی سے کہیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہے اور دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں اسی طرح موت کی نقاب کے اندر انسان بھی خدا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکسپیر اور غالب شراب کہنہ کی طرح جلوؤں کی پائستانی میں زمانہ کی روانی کے ساتھ ساتھ اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر ہمارے دوست نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ہمیشہ مرحوم ہی رہیں گے۔ اُن کے مضامین اس حالت میں بھی شائع ہوتے ہیں اور کتابیں بھی چھپا کرتی ہیں لیکن اس پردے میں کہ گویا یہ مرحوم کے پرانے مسودے ہیں جو باقیات الصالحات کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سُنا ہے کہ ان کے چند وِرثا ان کی تصانیف اور تالیفات کو یکجا شائع کرنے کیلئے ایک لمیٹڈ کمپنی کے قیام پر غور کر رہے ہیں۔

اسی ضمن میں ان کی اس مفروضہ موت سے جو نقصانات ہوئے ان کی تفصیل بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ ذیل میں ان کی بالتفصیل فہرست دی جاتی ہے۔

(۱) ان کے اعزہ، اقارب اور دوستوں کا ایک انبوہ کثیر ہندوستان کے مختلف مقامات سے تعزیت کی غرض سے ان کے بڑے بھائی صاحب کے مکان پر مجتمع ہوا۔ ان کے اخراجات کا بل اتنا ہی ہے جتنا خود ان کی تقریب شادی کا خرچ،

(۲) ان کے کالج کی یونین میں تعزیتی جلسے کی بنا رکھی گئی جس میں اولڈ بوائز

کی طرف سے تعزیتی ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

(۳) ان کے دفتر کی اسامی کے لئے لاتعداد عرضیاں آئیں، سفارشیں لائی گئیں اور ملاقاتیں لی گئیں۔ یہ مغالطہ اس حد تک بڑھا کہ محکمہ کی طرف سے انچارج افسر کے نام خالی جگہ کی اطلاع دینے میں تساہل کرنے پر اظہار ناراضگی کیا گیا تھا۔

(۴) پولیس کو ان کی موت کی خبر سن کر ان کے اعزہ پر زہر خورانی کا شک ہو گیا تھا۔

(۵) ان کے ورثائ کے نام پولیس افسر کی طرف سے بندوق کے لائسنس کو واپس کرنے کا حکم صادر ہو گیا تھا۔

(۶) میونسپلٹی کے دفتر نے ان کے اعزہ پر مقدمہ چلانے کی دھمکی دی تھی کیونکہ خفی رجسٹر کی خانہ پُری نہیں کی جا سکتی تھی۔

(۷) جج صاحب نے ان کی موت کی اخباری خبر کے تیقن پر ان کا ایک دعویٰ خارج کر دیا تھا۔

(۸) انجمن نکاح بیوگان کے سیکریٹری صاحب نے عملی مثال قائم کرنے کے لئے اپنا ذاتی پیام ان کی سوگوار بیوہ کے نام ارسال کیا تھا۔

آیئے ہم آپ بھی فاتحہ میں شریک ہو جائیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،

(ساقی)

بیکاری!

"دفتر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا آپ نے باہر لٹکا ہوا بورڈ نہیں دیکھا" یہ صاف جواب سُن کر میرے پیر تھرتھرانے لگے۔ مجھکو خوب معلوم تھا کہ ایک پُرانا کلرک کل ہی مرا ہے اور اس کی جگہ خالی ہوئی ہے اس لئے میں اپنی قسمت آزمائی کرنے یہاں آیا تھا قاعدہ ہے کہ مُردے کی بو سونگھ کر یا تو غسال آتے ہیں یا تلقین پڑھنے والے مولوی یا کفن گھسوٹ خیراتی یا اس مرحوم کے لڑکے اگر وہ دولتمند تھا، مگر متوفی کلرک سے ہیں ان متذکرہ بالا قسموں میں سے ایک بھی مناسبت نہ تھی۔ ہم تو صرف اپنے اس حق کو لینے آئے تھے جو بڈھا کلرک اپنی درازی عمر کی وجہ سے غصب کئے بیٹھا تھا۔

ہم متواتر چار سال سے بی۔اے کی دیوار پر اچک اچک کر نشانہ لگا رہے تھے، مگر ہر مرتبہ وار خالی ہی جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نوکری کی سبز پری کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش بھی کئے جاتے تھے اور جس طرح صبح اٹھ کر ہم چہل قدمی کرنے جایا کرتے تھے اسی طرح روزانہ کا مشغلہ یہ بھی تھا کہ کسی نہ کسی دفتر میں بھی پہونچ جاتے تھے اور بابو جی یا چپراسی صاحب جو کوئی بھی ملتے تھے تو اُن سے "جگہ خالی ہے" کا سوال کر بیٹھتے تھے اور اسی بہانہ اندر قدم رکھ کر ان تمام بابوؤں کا جائزہ بھی لے لیا کرتے تھے جو کرسیوں پر

پر بیٹھے، ڈیسکوں پر گردن جھکائے دنیا و مافیہا سے بےخبر اپنے اپنے رجسٹروں میں
مستغرق نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے تھے مگر حقارت سے
جس پر ہم شرما کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ شاید ان کو بلا عرضی دیئے ہوئے اور دفتروں
کے چکر لگائے بغیر یہ اسامیاں مل گئی تھیں۔

جب چار سال سے متواتر یہی مشغلہ ہو تو ہم کیوں نہ شہر کے دفتروں کی ڈائرکٹری
اور جنتری بن جائیں۔ شہر کے تمام بابوؤں کی قسموں اور عادتوں کے ہم اتنے ہی بڑے
عالم بن گئے تھے جتنے بڑے ہماری یونیورسٹی کے ایک پروفیسر درختوں اور جانوروں
کے عالم تھے۔ ہم نے دیکھا کہ یا تو تمام بابو جوان ہیں یا ادھیڑ اور اگر کچھ بوڑھے ہیں
بھی تو وہ اپنے قویٰ کے لحاظ سے ہم نوجوانوں سے بھی زیادہ جینے کی قابلیت رکھتے
ہیں اس لئے اب ہمارے سامنے ایک ہی راہ تھی۔ تخفیف کی وجہ سے دفتروں
میں کسی نئی جگہ کا نکلنا ناممکن تھا۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت کا سدھرنا بھی
ایک امر موہوم تھا اس لئے ہم کو تلاش تھی ایسے بابوؤں کی جو اب دنیا سے بھی رخصت
لینے والے ہوں۔ خوش قسمتی سے ایک دفتر میں کونے کی ایک میز پر بیٹھا ہوا ایک
بابو ہم کو نظر آیا جس کے متعلق یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یہ عنقریب چولا بدلنے
والا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بوڑھا بھی تھا اور سوکھا بھی اور کھانستا اس طرح تھا
جیسے کوئی دق کا بیمار۔

واقعی زندگی اور نوکری اس پر بڑا ظلم تھا۔

آپ ضرور یہ خیال کرینگے کہ ہم اس بابو کی موت کے متمنی تھے۔ مگر جناب یہ خیال تو کیجئے کہ بچپنے ہی میں ہماری شادی کردی گئی تھی اور جب تک بی۔ اے بین پہنچیں ہم تہائی درجن بچوں کے باپ ہوگئے تھے۔ اس پر مصیبت یہ تھی کہ جس وقت ہم اپنے فرسٹ ایڈیشن صاحبزادے کے رجسٹرڈ پبلشر بنے ہیں اسی وقت ہمارے والد اس دارفانی کے دفتر سے عالم جاودانی کے دفتر میں منتقل کردیئے گئے۔ قدرت نے شاید ان کو مدزائد میں خیال کیا ہو۔ وہ تو کہئے ہماری بیگم صاحبہ جو چار درجہ کی حاسدہ تھیں ہم کو اپنا زیور بیچ بیچ کر پڑھا رہی تھیں اور یہ انھیں کی کوششوں کا طفیل تھا کہ ہم لڑھکتے فیل ہوتے سستاتے۔ دم لیتے اور گرتے کھاتے کسی نہ کسی طرح بی۔ اے فیل کہلائے جانے کے مستحق ہوگئے تھے ورنہ میٹرک بھی نہ ہوسکتے ان کا مقصد دراصل ہم کو فائدہ پہونچانے کا نہ تھا بلکہ ہمارے محلہ میں ایک صاحب بیرسٹر تھے جو خود تو بی۔ اے تھے مگر برائے نام۔ دراصل انھوں نے اس ڈگری کے نیابت اپنی اہلیہ کے نام منتقل کردیئے تھے جو نسوانی رسالوں میں اپنا نام مسز محمود بی۔ اے لکھا کرتی تھیں۔ تیصنہ محاذانہ اسی کو کہتے ہیں۔ بس یہی خیال ہماری بیگم صاحبہ کو بھی بیچین کئے رہتا تھا کہ کب ہم بی۔ اے پاس ہوں اور کب وہ ان الفاظ کو جھپٹ کر اپنے نام کے آگے لگائیں اور اپنے ہمسایہ سے سر اٹھا کر بات کرسکیں۔ انھوں نے اسی انتظار میں مضمون نگاری بھی شروع نہیں کی تھی ورنہ وہ کب کی کہنہ مشق، ہوگئی ہوتیں اور نیرنگ خیال کے نگارش لطیف نمبر کے خاص کالموں میں جگہ

پا چکی ہوتیں۔ اب جبکہ چار سال کی پیہم کوششوں سے ہم بی۔اے پاس نہ کر سکے اور اس طرح اپنی بیگم کے دوپٹہ کے لئے بی۔اے کی بیل فراہم نہ کر سکے تو وہ ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئیں۔ پھر بتایئے اگر ہم نوکری کے لئے زیادہ تگ و دو نہ کرتے تو کیا کرتے۔

ہاں! تو اب ہم نے اپنی کوششوں کو صرف ایک دفتر کیلئے وقف کر دیا تھا اور وہ دفتر وہی تھا جس میں وہ بڈھا کلرک اپنی زندگی کے باقی دن کھانس کھانس کر گذار رہا تھا۔ "الانتظار اشد من الموت" ایسے ہی موقعوں پر کہا گیا ہے۔ ہر روز صبح کو دفتر کے قریب جانا۔ کھڑکی میں سے جھانکنا اور بڈھے کلرک کو حسب دستور اسی جگہ بیٹھے ہوئے پانا ہمارے لئے سخت امتحان تھا۔ مگر امید پر دنیا قائم ہے۔ مہینوں کی لگا تار کوشش کے بعد ایک روز ہم نے دیکھا کہ وہ کرسی خالی ہے۔ واللہ ہم نے خیال کیا کہ کہیں ہماری آنکھیں غلطی تو نہیں کر رہی ہیں مگر وہ تو حقیقت تھی۔ ہم جلدی سے دفتر کے برآمدے میں پہونچے اور ایک نوجوان بابو سے جو تھکن اتارنے کے لئے باہر کھڑے سگریٹ کے دم لگا رہے تھے اس کے متعلق استفسار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کو سانس کا دورہ پڑا ہے اس لئے وہ گھر پر ہیں۔

"کے روز کی چھٹی لی ہے؟"

"تین روز کی۔"

"صرف تین روز کی۔" ہم نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس لحاظ سے تو مرض کی کچھ بھی

اہمیت نہیں معلوم ہوتی۔ کم از کم پندرہ روز کی تو رخصت لینا چاہیے تھی۔

"وہ کہاں رہتے ہیں"؟ ہم نے لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کوئی کام ہے؟"

"نہیں" میرے منہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔ "ہاں ذرا عیادت کو جاتا" میں نے بعد کو لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں اُن کو۔"

"کیوں نہیں!" ہم کو مجبوراً کہنا پڑا اور اس طرح کہنا پڑا کہ گویا ہم اس کے ان بیجا سوالات پر تاؤ پیچ کھا رہے ہیں۔

"معاف کیجیے۔" اُس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس لیے پوچھا کہ آپ کو میں نے اس سے قبل کئی دفعہ ادھر سے گذرتے دیکھا مگر صاحب سلامت ہوتے نہیں دیکھی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں تھی جناب"۔ ہم نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے۔ ہاں تو آپ کو ان کے مکان کا پتہ بتا دوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں۔"

"میرا تو کوئی حرج نہیں ہے مگر ہاں آپ کو بڑی دقت سے پتہ چلیگا۔ خوب یاد آیا! مجھے بھی ایک گھنٹہ کے بعد وہیں جانا تھا۔ میں ابھی چلا چلونگا، آپ ہی کے ساتھ۔"

"مگر آپ میری وجہ سے کیوں حرج کرتے ہیں؟"

"حرج کا ہیکا حضت! یہ تو میرا فرض ہے کہ آپ کی رہبری کروں۔"

"آپ ان کے کوئی عزیز ہیں"۔

"میں ان کا داماد ہوں"۔

"ارے رے"۔ ہم نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ تو بُرا ہوا"۔ ہم سوچنے لگے۔

"آیئے جناب اندر آجایئے۔ بس چند منٹ آپ کو انتظار کرنا پڑیگا"۔ اس نے اس آواز میں کہا کہ ہم نے گھبرا کر اپنے قدم سیڑھیوں پر رکھ ہی تو دیئے اور اندر کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ ہی تو گئے۔

"میں ابھی حاضر ہوا"۔ کہہ کر وہ چک اٹھا کر دوسرے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔
یہاں عیادت کس کو منظور تھی۔ اس بڈھے کلرک سے جان پہچان بھی نہ تھی مکان کا پتہ پوچھ کر ہم آفت میں پڑ گئے۔ اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ان حضرت سے اپنا پیچھا کس طرح چھڑائیں ابھی کسی رائے پر پہونچنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے نئے دوست ملک الموت کی طرح دوسرے کمرے میں سے چھڑی ہاتھ میں لئے ہوئے نکلے اور ہمارے سر پر پہونچکر ہنس دیئے اور "تشریف لایئے جناب" کہہ کر ہماری رہنمائی کرنے کو آگے بڑھ گئے۔

مجبوراً ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگے مگر اس وقت دماغ کچھ ایسا کند تھا کہ کوئی ترکیب بھی ذہن میں نہ آئی۔ آخر اس خیال سے کہ کہیں ان کا مکان جلد نہ آجائے اور اس حالت میں ہم کو مجبوراً عیادت کے لئے جا کر ندامت نہ اٹھانا پڑے ہم نے اسی وقت فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا۔

"آپ کا کیا اسم مبارک ہے جناب"! انھوں نے ہم سے سوال کیا۔ جس کا جواب ہم نے اپنی محویت کے عالم میں دینا مناسب نہ سمجھا اور ایک برطانوی مدبر کی طرح اس مشکل کو حل ہی کرلیا۔ ہم نے اپنے چاروں طرف نگاہ اٹھا کر آئندو روند کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے سے ایک صاحب اس تیزی سے چلے آرہے تھے کہ ان پر یہی اطلاق کیا جاسکتا تھا کہ شاید کسی حادثہ کی بنا پر ڈاکٹر کو بلانے جارہے ہیں اور یا کسی جگہ دعوت میں تشریف لئے جارہے ہیں۔ شکر ہے خدا کا کہ ہم ان کے ہارس پاور کا پہلے سے حساب لگا کر ان کے راستے کی پٹری سے علیحدہ ہٹ آئے تھے ورنہ ممکن تھا کہ اتصال باہمی سے ہمارے ماتھے اور ناک میں کسی کو ضرور ضرب شدید کا حامل ہونا پڑتا۔ جب وہ ہمارے قریب سے پنجاب میل کی طرح سے نکل گئے تو میں نے فوراً ہی اپنے دوست سے مڑ کر کہا۔

"افوہ! دیکھئے پہچانتے بھی نہیں"۔

"کیوں کون ہیں؟" انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے صاحب، ان کی تلاش میں میں چھ ماہ سے گھوم رہا تھا۔ میری سونے کی گھڑی نہ معلوم کہاں لیکر غائب ہوگئے تھے"۔

میں نے آواز میں ارتعاش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا بھائی! میں پھر حاضر ہونگا۔ یہ موقع غنیمت ہے ورنہ پھر ہاتھ نہ آئینگے"۔ ...... جلدی جلدی کہکر اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں پلٹ پڑا اور اپنے فرضی چور کے پیچھے

"اجی حضت! ۔ جناب، جناب!" ۔ کہتا ہوا لپکا۔ میرے دوست بھی اس دلچسپ پلاٹ سے مفت محظوظ ہونے کیلئے میری امید کے خلاف میرے پیچھے آنے لگے اسی دوران میں میری صداؤں کا اتنا اثر تو ہوا کہ وہ بادپا شخص ٹھٹکا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا اور جب میں نے "ذرا سنئے" کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ بھی شامل کیا تو وہ رک گیا۔ میں آناً فاناً اس شخص کے پاس پہونچا اور "بھائی بچانا" اس انداز سے کہا کہ وہ پریشان ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

"اس کے پاس بم ہے" میں نے اپنے دوست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو مقناطیس کی سوئی کی طرح اس صورت سے کھنچے آرہے تھے کہ اس شخص کو پختہ یقین ہو گیا اور وہ میرے اضطراب سے متاثر ہو کر گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے میں اس انداز سے دوڑنے لگا کہ گویا تعاقب کر رہا ہوں۔ ہم دونوں تقریباً دو فرلانگ دوڑنے کے بعد سڑک کے ایک سہ راہے پر پہونچے جہاں سے میں نے اپنے قدم سست کرکے ایک پان والے کی دوکان کی طرف رخ کر دیا اور وہ شخص متواتر دوڑے گیا۔ یہاں تک کہ دو تین ہی منٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اتفاقاً اسی دوکان پر اسی دفتر کا چپراسی بھی بیڑی کا بنڈل خرید رہا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کی تواضع سگریٹ سے کرنے کے بعد باتوں ہی باتوں میں اس بڈھے کلرک کا نام پتہ اور بیماری کا حال پوری طرح سے معلوم کر لیا البتہ

جس ڈاکٹر کا وہ علاج کر رہے تھے اس کا پتہ اور نام نہ معلوم ہو سکا۔ ورنہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس سے جا کر ان کے مرض کے متعلق دریافت کرونگا کہ آیا سخت ہے یا یونہی سا ہے۔

شام کے وقت جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تو میں ان کے مکان کو تلاش کر کے اس کے پاس جا کر اس طرح منڈلانے لگا کہ آئندورفت میں سے کوئی میرے اوپر شک نہ کرے۔ اس کمبخت داماد کی طرف سے البتہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ مگر کوئی اہم بات نہ معلوم ہو سکی۔ اس روز سے میرے ذمہ ڈبل ڈیوٹی ہو گئی۔ صبح کو دفتر کی دیوار کے اوپر سے جھانکنا اور شام کو ان کے مکان کے گرد طواف کرنا۔ حیرت تو یہ تھی کہ ان کے مکان کے اندر ایسا سناٹا تھا کہ نہ تو کسی کے بولنے کی آواز آتی تھی اور نہ رونے کی۔ گھر کے اندر سے کچھ آدمی نکلتے ضرور تھے مگر ان کے چہرے اور دوسری حرکات سے کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں پائے جاتے تھے اور نہ ان کے ہاتھوں میں دواؤں کی شیشیاں ہوتی تھیں۔ اس لئے میری الجھن بڑھتی جاتی تھی۔ ان کے مکان کے قریب لے دے کے صرف ایک بنئے کی دوکان تھی جہاں گاہکوں کی اتنی کثرت رہتی تھی کہ میں کچھ پوچھتے ہوئے جھجکتا تھا۔

ایک شام کو سڑک کی لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک درخت کے نیچے ٹھیک ان کے مکان کے سامنے کھڑا ہوا میں حسب معمول جاسوسی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پیشتر اس کے کہ میں مڑوں

1559

نوواردنے سلسلہ کلام بھی جاری کر دیا۔
"کہئے آپ کی گھڑی مل گئی ؟"
میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ کیونکہ یہ شخص وہی تھا جس کا سامنا میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"جی جی" میں نے گھبرائے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے میں نے اپنی گردن کو نفی میں ہلا دیا۔
"وہ مجھ کو دیکھکر بھاگنے کیوں لگا تھا۔"
میں ان کے اس سوال پر قہقہہ مار کر ہنسا تاکہ اس دوران میں مجھے اُن کے اس بیساختہ سوال کا جواب سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت مل جائے۔ اس کے بعد میں نے جواب دیا کہ میں نے اس کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم میری گھڑی واپس نہ دوگے تو میں تمھیں اپنے دوست کے جو خفیہ پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہیں حوالہ کر دونگا۔
"قہ قہ قہ" وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگے۔
"کہئے آپ کے خسر کا کیسا مزاج ہے ؟" میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر سوال کیا۔
"اللہ مالک ہے۔" اُنھوں نے اس مایوسی سے کہا کہ میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی جیسے شکر ہے خدا کا کہ انھوں نے دیکھا نہیں ،

"اچھا آداب عرض ہے۔" کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میرا اس طرح بموقع کھڑے ہو کر ایسے غیر مناسب وقت پر عین ان کے مکان کے سامنے جاسوسی کرنا بادی النظر میں ہر شریف شخص کو اشتباہ دلا سکتا تھا۔ اس لیئے میں نے اس دن سے ارادہ کر لیا کہ اب اس طرف کبھی نہ جاؤنگا۔ دو روز تک تو اس عہد پر قائم رہا مگر تیسرے روز طبیعت نہ مانی۔ اپنی خالی جیب اور خالی مکان کو جس میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے دیکھکر ہم کو پھر اضطراب ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کشاں کشاں پھر اسی طرف چلے۔ جب ہم اس محلے میں پہونچے تو کچھ عورتوں کے رونے پیٹنے کی آواز ہمارے کان میں آئی جیسے جیسے ہم ان کے مکان کے قریب پہونچتے جاتے تھے ان آوازوں کا شور بھی بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ہم دروازے کے قریب پہونچے ہیں تو معلوم ہوا کہ سارا مکان عورتوں سے بھرا ہوا ہے جو گریہ و بکا اور آہ و زاری میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اندر روشنی بھی زیادہ تھی اور کبھی کبھی دو ایک مردوں کی بھاری چیخوں اور آہوں کی آواز بھی عورتوں کی باریک آوازوں میں ملی جلی سنائی دیتی تھی۔ اب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ آج وہ بڈھا چل بسا ــــــ ادھر ہمارے کانوں میں یہ آوازیں آ رہی تھیں اور ادھر ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ رہے تھے ــــ ہم خود کو دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک دفتر میں کرنے کی میز پر بیٹھے ہوئے چپراسیوں پر حکم چلا رہے ہیں۔

ہم نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے وہاں سے بے تحاشہ بھاگے اور راستے میں سے عرضی لکھنے کا کاغذ خریدتے ہوئے گھر پہنچے۔ اسی وقت ہم نے ایک عرضی اس دفتر کے بڑے افسر کے نام لکھی۔ جس میں جگہ خالی ہونے کا مکمل ثبوت دینے کے لئے ہم نے متوفی کلرک کا نام اور اس کی موت کا واقعہ بھی تحریر کر دیا۔ آخر میں اپنی لیاقت، غربت اور شرافت کا احوال لکھ کر ان سرٹیفکٹوں کو بھی نتھی کر دیا جو ہم کو ایسے آدمیوں سے ملے تھے جنھوں نے ہم کو آج تک کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔

جس طرح شمع پروانوں کو کھینچتی ہے اسی طرح نوکری نوکروں کو اپنی طرف گھسیٹتی ہے۔ اسی خیال سے میں وہ عرضی لے کر جلد از جلد دفتر پہونچ گیا تاکہ دوسرے درخواست کرنے والوں سے میرا نمبر اوّل رہے۔

"آج تو جگہ خالی ہے" کہہ کر میں دفتر میں داخل ہو گیا اور سامنے بیٹھے ہوئے کلرک سے اس امر کی بابت استفسار کرنے لگا۔

"آخر روز روز پوچھنے سے کیا فائدہ۔ جگہ کا خالی ہونا آسان نہیں ہے۔" اس نے تیز لہجہ میں جواب دیا۔

واقعی ہم کو اس وقت بہت غصہ آیا کہ یہ کیسا دفتر ہے جس میں کلرکوں کی موت اور پیدائش کی خبر تک نہیں آتی۔ مگر ہم غصہ کو محض اس خیال سے پی گئے کہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم نے مرنے سے قبل اطلاع نہ کرائی ہو یا انھوں نے

اس امر کی وصیت کی ہو اور کسی نے ابھی تک اس کی تعمیل نہ کی ہو۔

"جناب آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ کل ہی جگہ خالی ہوئی ہے۔"

"کس کی؟"

"اُن صاحب کی جو وہاں کونے میں بیٹھے کھانسا کرتے تھے۔"

"کون؟ رحمت علی صاحب۔"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟ کیا انھوں نے استعفیٰ دیدیا۔"

"نہیں بلا استعفیٰ اور بغیر نوٹس کے۔"

"کیسے؟"

"کل اُنکا انتقال ہوگیا۔"

"ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"واقعہ عرض کرتا ہوں، میرے سامنے ہی ان کا انتقال ہوا ہے۔"

"افسوس۔ انا للّٰہ۔ ہاہ۔"

"یہ عرضی حاضر ہے۔"

"جناب میں عرضی ورضی نہیں لے سکتا۔ ایسا ہی ہے تو آپ بڑے بابو صاحب کے دفتر میں بیٹھیے۔"

"بہتر ہے۔ بتا دیجیئے کہاں؟"

اُس کلرک پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھیں پرآب ہوگئیں بہرحال ہماری مروّت سے وہ ہمیں ہیڈ کلرک کے دفتر میں لے گیا اور وہاں کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ تقریبًا ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس دفتر کے ناخدا تشریف لائے جن کے سامنے میں نے اپنی عرضی بصد ادب رکھدی۔ وہ عرضی پڑھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے یہاں تک کہ پوری ختم کر لینے پر کرسی پر دراز ہو کر میری طرف مخاطب ہوئے۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ رحمت علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔"

"وہ سخت بیمار تھے۔"

"خوب، ان کی بیماری سے آپنے نتیجہ نکال لیا کہ وہ مر گئے۔"

"نہیں جناب۔ کل ان کے گھر میں بہت زبردست رونا پیٹنا ہو رہا تھا۔"

"اچھا، تب تو کوئی شک ہی نہ رہا۔ افسوس، رحمت علی صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے ان کی یاد میں اس دفتر کو آج بند کرنا پڑیگا۔ اسلیئے آپ کل تشریف لائیگا۔ میں آپ کی عرضی رکھے لیتا ہوں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" کہہ کر میں اٹھا ہی تھا کہ انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے روک کر مجھے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔

"دیکھئے میں آپ کا معاملہ ابھی طے کیئے دیتا ہوں۔"

انھوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی جی حضور کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا جس کو سن کر وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں چلمن ہٹی اور وہی نوجوان بابو اندر داخل ہوا جس نے میری یہاں تک رہبری کی تھی۔ وہ مجھکو دیکھ کر گھورنے لگا اور کچھ کہے بغیر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اُس متوفی کلرک کا داماد داخل ہوا جسے دیکھ کر میں ذرا گھبرا گیا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چک پھر ہٹی اور اس مرتبہ وہ شخص داخل ہوا جسے دیکھ کر میں "ہائیں" کہہ کر بے اختیار اچھلا اور پھر دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ ارے یہ تو وہی بڈھا کلرک تھا جس کو میں مُردہ خیال کئے ہوئے بیٹھا تھا اور جس کے ماتم کی آوازیں میں خود اپنے کانوں سے سن کر آیا تھا۔ اگر کہیں تنہائی میں ملاقات ہوتی تو میں اس کو روح کا مجسمہ خیال کر کے ڈر سے آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر یہاں تو اس کا امکان ہی نہ تھا کیونکہ پہلے کی نسبت وہ کافی تندرست تھا۔ میرا بند بند کانپنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ اُٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر پیر مَن مَن بھر کے وزنی معلوم ہوتے تھے۔ ایک تو نوکری نہ ملنے کی ناامیدی اور دوسرا اس بھرے دفتر کی ندامت۔ یاالٰہی کس میں طاقت ہے کہ ان دو مصیبتوں کو اٹھائے۔ بہر حال گردن جھکائے آنکھیں نیچی کئے میں کرسی پر بیٹھا ہی رہا یہاں تک کہ سارا کمرہ بابوؤں سے بھر گیا۔

"رحمت علی صاحب" ہیڈ کلرک نے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں آپ کو غسل صحت پر مبارکباد دیتا ہوں۔" اُنھوں نے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد وہ مسکرا کر پوچھنے لگے کہ "کل رات آپ کے یہاں یہ کیسا ہنگامہ تھا؟"

"جی!" رحمت علی صاحب کہنے لگے۔ "کل میرا غسل صحت تھا۔ عورتوں نے منت مانی تھی کہ جب میں اچھا ہو جاؤنگا تو مجلس امام حسینؑ منعقد کرینگی۔"

یہ سُن کر ہیڈ کلرک نے میری طرف رخ کر کے رحمت علی صاحب سے کہا۔ "دیکھئے آپ سے ملئے بس آپ کے نادیدہ مشتاق ہیں۔ خاص آپ ہی کیلئے تشریف لائے ہیں۔"

وہ میری طرف بڑھے۔ مجھکو بھی بمجبوری کرسی چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لیا کچھ الفاظ کہے۔ مگر میں جلدی سے فوراً چک ہٹا کر باہر نکل آیا۔

(نیرنگ خیال)

ہل چل

اشخاص ڈرامہ

لطیفہ		
سعیدہ	}	بہنیں
کنیزہ		
نمودہ		لطیفہ کی سولہ برس کی لڑکی۔
نعیمہ		سعیدہ کی تیرہ برس کی لڑکی۔
عزیز		لطیفہ کا اٹھارہ برس کا لڑکا۔
رفن		سعیدہ کا سات برس کا لڑکا۔
مسیتا		تیرہ برس کا چھوکرا۔
ڈاکٹر		

نوٹ:- یہ نام سب فرضی ہیں۔

جائے وقوع - ہندوستان کا ایک شہر

اشخاص ڈرامہ کی حیثیت ـــــ شریف طبقہ، خوشحال، تعلیم یافتہ اور مہذب پرانی وضع کے پابند۔

وقت ــــ اپریل سہ پہر

مکان ــــ پختہ، باہر سے شاندار، لیکن اندر سے استرکاری اور سفیدی سے محروم، کئی جگہ سے اینٹیں اپنے شکستہ اور پرانے دانت دکھا رہی ہیں

خاکہ ــــ شمالی سمت، دالان در دالان،

جنوبی سمت، بیرونی دروازہ۔ ڈیوڑھی۔ کمرہ

مشرقی سمت، باورچی خانہ۔ طہارت خانہ۔ حمام

مغربی سمت، دُہرا کمرہ

صحن۔ کشادہ

پہلا ایکٹ

سین ا

تعارف:۔ [صحن میں تخت بچھا ہوا ہے۔ جس پر ایک معظمہ بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں قریب کے پلنگوں پر طوطے کا پنجرہ۔ چھوٹا بچہ، مرغیاں، کبوتر، کھانے کے برتن وغیرہ علی الترتیب رکھے ہوئے اور بیٹھے ہوئے ہیں۔ ملحقہ چھوٹی چوکی پر ایک اوسط العمر خاتون بیٹھی ہوئی وضو کر رہی ہیں۔ باورچی خانہ میں خادمہ برتن مانجھ رہی ہے اور ایک صاحبزادی سالن بھون رہی ہیں۔

مکان سے باہر سڑک پر سے ایک موٹر آہستہ آہستہ آتی ہے اور مکان مذکورہ کے سامنے رک جاتی ہے اس کے اندر سے ایک شریف آدمی نکلتا ہے اور سیٹ پر سے ہینڈ بیگ اٹھا کر

دروازے کی طرف رخ کرتا ہے۔ زنجیر ہلاکر اپنی آمد کی اطلاع دیتا ہے اور فوراً ہی رخ پھیر کر مخالف سمت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دھوپ اس کے تمام جسم پر پڑ رہی ہے۔ چہرے کو بچانے کے لئے ہیٹ کو نیچے سرکا لیتا ہے۔]

لطیفہ۔ (زنجیر کی آواز سن کر) مسینا! باہر دیکھ کون ہے؟

[مسینا باہر جاتا ہے اور گھبرایا ہوا واپس آتا ہے]

مسینا۔ ارے ڈاکٹر صاحب ہیں۔

عزیز۔ (باواز) جلدی پردہ کرو جلدی (آہستہ) میں نے اپنا پائجامہ کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ ملتا ہی نہیں۔

نعیمہ۔ بھائی جان وہ دھوبن لے گئی ہے۔ ابھی تو گئی ہے۔

عزیز۔ (مضطربانہ) غضب کر دیا۔ لو اب ہمارے پاس کوئی پائجامہ ہی نہیں ہے واشنگ کمپنی سے ابھی کپڑے نہیں آئے (تیز ہو کر) آخر پوچھ تو لیا ہوتا ابھی اب کیا میں ڈاکٹر کے سامنے لنگی باندھے جاؤں (رخ پھیر کر) پردہ ہو گیا کیا۔

(صحن میں آکر) آخر یہ ابھی تک کیا ہو رہا ہے؟

نعیمہ۔ پردہ کا سامان،

محمودہ۔ ذرا سا گوشت بھون لوں تو اٹھتی ہوں۔

لطیفہ۔ ذرا سا زردہ کھا لوں۔

کنیزہ۔ ذرا سی کنگھی کر لوں۔

سعیدہ ۔ (نماز میں بولتے ہوئے) ذرا سی نماز پڑھ لوں۔

نعیمہ ۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) دوبارہ شروع کیجئے گا یا اسی کو جوڑ یگا۔

سعیدہ ۔ (ہونٹھوں پر انگلی رکھ کر) ہونہہ، خاموش،

[زنجیر ہلانے کی آواز دوبارہ آتی ہے جس کو سن کر سب پر بےچینی طاری ہو جاتی ہے]

عزیز ۔ (دانت بھینچکر) ارے صاحب خدا کے لیۓ پردہ کر لیجئے۔ بندہ نے گھنٹہ بھر پہلے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ڈاکٹر آنے والا ہے۔ تیار ہو جائیے گا باہر دھوپ میں کھڑا اچھل رہا ہوگا بیچارہ۔

کنیزہ ۔ (چوٹی میں موباف کی جگہ کمر بند باندھتے ہوئے) ارے بھئی ہاتھ پیر کیوں پھلائے دیتے ہو، ابھی ہوا جاتا ہے پردہ۔ آخر تم باہر جا کر ڈیوڑھی میں کیوں نہیں بٹھاتے۔ ذرا کہہ آؤ کہ ابھی بلاتے ہیں۔

عزیز۔ وہ پائجامہ جو دیدیا گیا ہے ہمارا دھوبن کمبخت کو۔

لطیفہ ۔ بس پائجامہ کی جان کو رو رہے ہیں۔ سنتے سنتے کان پک گئے ۔۔۔ پائجامہ، پائجامہ۔ ماتم کرو۔

عزیز۔ (غصہ میں) سیتا! بلا لے ڈاکٹر کو، اچھا ہے۔ آج ان لوگوں کا سامنا ہو جائے

(سیتا باہر جاتا ہے۔ اسی وقت زنجیر ہلانے کی آواز تیزی سے آتی ہے اور متواتر چند منٹ تک سنائی دیتی ہے)

محمودہ ۔ کاش یہ ڈاکٹر اندھا ہوتا یا میں ۔۔۔،

{جلتی پتیلی کو کسی کپڑے کی مدد کے بغیر اٹھانے کی کوشش کرتی ہے اور جب زبردست چپکا لگتا ہے۔ تو چیخ مارتی ہے اور پتیلی کو دونوں ہاتھوں سے زمین پر پٹک دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب گوشت الٹ جاتا ہے۔ ہائے میرے اللہ کہہ کر جلے ہوئے ہاتھوں کو پانی کی پتیلی میں ڈبوتی ہے} ہاتھ جل جاتے ہیں۔ دل بھن جاتا ہے۔ مگر شدت کے پردے پر آنچ بھی نہیں آتی۔

لطیفہ ۔ (سر پیٹ کر) ہے ہے کیا کروں۔ {گھبرا کر تخت سے اترنے کی کوشش کرتی ہے اور پاندان کو زنجیر لگائے بغیر ہی اٹھاتی ہے۔ کلھیاں، ڈبیاں قلابازی کھاتی ہیں اور کتھے چونے، تمباکو اور چھالیہ کا ایک اعلیٰ درجہ کا مکسچر تیار ہو جاتا ہے] اوئی (غصہ سے کانپ کر) عزیز تم پر خدا کی مار۔

عزیز (ہنس کر) خدا نہ کرے۔ (زیر لب) فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔

سعیدہ ۔ (اس موقع پر نماز پڑھنے میں مشغول تھیں۔ رکوع کو توڑ کر سبحان ربی العظیم کہتی ہوئی اپنی ہمشیرہ کلاں کی مدد کرنے کو مڑتی ہیں) عزیز خدا تم کو بن بیاہا ہی رکھے (پیروں سے جوتا تلاش کرتے ہوئے) توبہ! یہ جوتہ کون پہن گیا۔

کنیزہ ۔ (پلنگ سے اٹھتے ہوئے اور آدھی گندھی ہوئی چوٹی کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے) اس گھر میں سب پیروں کے اندھے ہیں میرا جوتہ بھی کوئی پہن گیا۔

سعیدہ ۔ پھر تم کس کا جوتہ پہنے ہوئے ہو۔؟

کنیزہ ۔ (متعجب ہو کر) اے ہے یہ آپ کا جوتہ ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا ہے (لوٹا

اُٹھاتے ہوئے) ذرا چوکی پر ہو آؤں تو دیتی ہوں۔

سعیدہ۔(تیز ہوکر) میں اس وقت تک کھڑی رہونگی کیا؟

کنیزہ۔(ہنس کر) آپ باقی نماز پڑھ لیجیئے جب تک۔

لطیفہ۔تم کو بھی بے وقت کا راگ سوجھتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی چوکی پر جانے کا موقع ہے۔ ڈاکٹر جو کھڑا ہے۔

کنیزہ۔پہلے آپ کنٹھا چونہ علیحدہ کر لیجیئے۔

[مینا باہر سے گھبرایا ہوا آتا ہے]

مینا۔ڈاکٹر گیا۔

عزیز۔ اچھا ہوا گیا۔

سعیدہ۔ ہے ہے۔ کہاں تک ٹھہرتا؟

لطیفہ۔ موئے روکا بھی نہیں۔

سب۔ ارے دوڑ، ارے دوڑ،

مینا۔(قہقہہ لگاکر) ڈاکٹر صاحب آتے ہیں پردے والیو، پردہ کرلو۔

سب۔ رذات ڈرا دیا، اچھا بلاؤ۔

(پردہ ہٹتا ہے اور ڈاکٹر کی پتلون گھر کے اندر داخل ہوتی ہے سب سر پہ پیر رکھ کر شمالی سمت کے دالان کی طرف بھیڑیئے سے ڈری ہوئی بکریوں کی طرح بھاگتے ہیں،)

سب۔ مسیتا روک، روک،

لطیفہ۔ (ہانپتے ہوئے) پردہ ڈالدے۔

مسیتا۔ الگنی کہاں ہے۔ رسّی کسی نے کھول لی۔

کنیزہ۔ کسی نے کھول لی ہوگی۔ دوسری باندھ دو۔

مسیتا۔ کیل کہاں ہے۔ کسی نے گرادی۔

سعیدہ۔ کنیزہ نے کپڑے لٹکانے کو نکال لی تھی۔ دوسری ڈھونڈھلو۔

لطیفہ۔ اللہ ہی تمھارے عیبوں کا پردہ رکھے۔

[کیل ٹھونکی۔ رسی تانی، پردہ لٹکایا جب ڈاکٹر اندر آیا۔ مگر اسی وقت محمودہ جو اپنے جلے ہوئے ہاتھ پر آلو پیس کر تھوپ رہی تھی ڈاکٹر کو روبرو دیکھ کر صحت خانہ میں جو قریب ہی واقع ہے چھلانگ مار کر پناہ گزیں ہوتی ہیں۔]

عزیز۔ (ڈاکٹر کو دیکھ کر شرماتے ہوئے) آداب عرض ڈاکٹر صاحب، معاف کیجیے گا۔ (مسیتا سے) کُرسی۔

کنیزہ۔ (پردہ میں) کُرسی۔

نعیمہ۔ (پردہ میں) کُرسی۔

لطیفہ۔ (آہستہ سے) کُرسی پر مُرغی نے ......

عزیز۔ (باہر سے) قلم دوات۔

مسیتا۔ (چیخ کر) قلم دوات۔

نعیمہ ۔ (پردہ میں) قلم دوات ۔
ڈاکٹر ۔ مت تکلیف کرو ۔ فاؤنٹن پن ہے ۔

[ڈاکٹر مغربی سمت کے کمرے میں داخل ہو کر تمام سامان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہے اور چہرے پر تنفر کے آثار لاتا ہے ۔ کھرے پلنگ پر ایک سات برس کا بچہ چادر اوڑھے لیٹا ہے ۔ پلنگ کے نیچے نے پڑی ہوئی ہے ۔ جو مکھیوں کی آبادی کے لئے ضیافت کا کام دے رہی ہے ۔ اس کے قریب پانی کا لوٹا رکھا ہے ۔ پلنگ کے دوسری طرف کچھ اور پڑا ہوا ہے جس کو قریب کھڑی ہوئی مرغی للچائی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے ۔]

عزیز ۔ (مریض کی طرف اشارہ کرکے) یہ بڑے ذات شریف ہیں ۔ رات بھر بخار میں ہَل ہِلاتے ہیں اور دن بھر چلچلاتی دُھوپ میں تپنگ کے پیچھے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں ۔ سڑک پر سے جتنے خوانچے والے گزرتے ہیں ان سے الا بلا لے کر کھاتے ہیں ۔ رات کو بخار بہت تیز تھا ۔ آج دن کو بخار نہیں آیا

[باورچی خانے کے قریب سے شی شی کی آواز آتی ہے ۔ عزیز اپنے کلام کو منقطع کرکے دیکھتا ہے اور جب وہاں پر کسی کو نہیں پاتا تو پھر اپنا کلام جاری کرتا ہے سیفیا جاتا ہے]

محمودہ ۔ (اپنی جائے پناہ سے) او اندھے ، ارے ادھر ، ادھر دیکھ ، میں کب سے یہاں قید ہوں ۔
مسیتا ۔ (قہقہہ لگاتا ہے) ابھی کھڑی رہو ، ڈاکٹر چلا جائے تب نکلیو ۔

محمودہ۔ اچھا تو بڑی بیگم سے عطر کی شیشی لاکر دے جا میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔

[سیتا واپس آجاتا ہے]

ڈاکٹر۔ (عزیز سے) بیماری کو کتنے روز ہوئے ہیں؟

عزیز۔ تقریباً ایک ہفتہ (دالان کے اندر سے تالی بجانے کی آواز آتی ہے۔ عزیز پردہ کے پاس جاتا ہے) کہئے۔

لطیفہ (باواز بولتی ہے تاکہ ڈاکٹر بھی سنے) ہیں دس روز ہوئے اس کے بخار کو۔

سعیدہ۔ (قطع کلام کرتی ہیں) آپ ہیں کس خیال میں جمعہ جمعہ آٹھ، ہفتہ نو، اتوار دس پیر گیارہ منگل بارہ، بدھ تیرہ، آج چودھواں روز ہے۔ شاید بحران کا دن ہے۔

عزیز۔ (واپس آکر) بیانات مختلف ہیں ڈاکٹر صاحب،

ڈاکٹر۔ (مسکراکر) کتنے دست کل ہوئے تھے۔

عزیز۔ ہم نے گنے نہیں،

لطیفہ۔ (زور سے) ڈاکٹر صاحب پچیس آئے تھے۔

سعیدہ۔ (آہستہ) اے نہیں باجی غضب کرتی ہو (باآواز) ڈاکٹر صاحب پندرہ سے زیادہ نہیں تھے۔

نعیمہ۔ (چپکے سے) دن بھر آیا کئے۔ اماں تیس سے زیادہ تھے۔

لطیفہ۔ (جھنجھلاکر) ٹھیک کہتی ہے بچی۔ سعیدہ کو تو جھٹلانے کی عادت ہے،

(باواز) تیس تھے ڈاکٹر صاحب، بلکہ اس سے بھی دس پانچ زیادہ۔

ڈاکٹر۔ رنگ کیسا تھا۔

عزیز۔ دیکھئے پوچھتا ہوں۔ گواہوں کے بیان پر فیصلہ ہوگا۔

لطیفہ۔ (پردہ کے پاس آکر) مٹیالے رنگ کے تھے۔

نعیمہ۔ اے ہرے ہرے تھے خالہ اماں۔

لطیفہ۔ ہاں! نہیں ڈاکٹر صاحب مٹیلے نہیں ہرے رنگ کے تھے۔

کنیزہ۔ ایک ہرے رنگ کا تھا۔ باقی سب مٹیلے تھے۔

لطیفہ۔ (فاتحانہ انداز میں) میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ مٹیالے رنگ کے تھے بھئی مٹیالے رنگ کے تھے۔ سنتے ہو بیٹا عزیز۔

عزیز۔ معاملہ مشکوک نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر۔ پیشاب ہوا تھا؟

عزیز۔ مجھکو نہیں معلوم۔

لطیفہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

سعیدہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

کنیزہ۔ ہم کو نہیں معلوم۔

نعیمہ۔ اے لیجئے اتنا نہیں معلوم۔ رات کو بستر ہی پر پیشاب کیا تھا۔ جو دری ہٹانی پڑی تھی۔

لطیفہ۔ ہاں ہاں یاد آیا کیا تھا؟

سعیدہ۔ کیا تھا!

کنیزہ۔ کیا تھا۔

محمودہ۔ (اپنی جائے پناہ سے) وہ ننھے بھیا کا پیشاب تھا۔ رفن کا نہیں تھا بھئی۔

سب۔ (بیک آواز) ٹھیک کہتی ہیں۔ پیشاب نہیں ہوا تھا۔ پیشاب نہیں ہوا تھا۔

(ڈاکٹر مریض کو جھنجھلا کر دیکھتا ہے۔ تھرمامیٹر لگاتا ہے۔ نبض پر ہاتھ رکھتا ہے،
زبان دیکھتا ہے اور کھڑے کھڑے نسخہ لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔)

لطیفہ۔ عزیز میاں! ڈاکٹر صاحب سے کہنا کہ دوا میٹھی لکھیں۔ کڑوی دوا نہیں پیئے گا۔

سعیدہ۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ پہلے قوت کے انجکشن دیں۔

کنیزہ۔ ہاضمہ اس کا بہت خراب ہے۔

نعیمہ۔ بھوک لگتی ہی نہیں۔

عزیز۔ (زیر لب) اب کیا مجھکو کھائے گا (بآواز) اطمینان رکھئے کُلّا چلے ستّر بلا ٹلے کے اصول پر پہلے ہی سے عمل کرتا ہے۔

(ڈاکٹر خاموشی سے بیگ اٹھاتا ہے۔ فیس ایک ہاتھ سے لیتا ہے۔ اور دوسرے
ہاتھ سے نسخہ عزیز کو دیتا ہے۔ کچھ مختصر ہدایات کرتا ہے اور کمرے سے
نکل کر صحن میں آتا ہے۔)

لطیفہ ۔ (کراہکر) ڈاکٹر صاحب کو روک لینا ابھی مجھے بھی نبض دکھانی ہے ۔
سعیدہ ۔ (انگڑائی لیکر) میرا بھی ایک ہفتہ سے سر درد کرتا ہے ۔
کنیز ۔ (کمزور آواز میں) مجھکو اختلاج قلب بہت بڑھ گیا ہے ڈاکٹر صاحب ۔
لطیفہ ۔ ذرا دم تو لو ۔ ڈاکٹر صاحب کہیں بھاگے نہیں جاتے ہیں ۔ جیسے مطب میں بیٹھے ویسے یہاں بیٹھے ۔ اطمینان سے حال کہو ۔
نعیمہ ۔ میری ناک میں پھنسی نکل آئی ہے ۔
مسیتا ۔ مجھے بھوک بہت لگتی ہے ڈاکٹر صاحب ۔ بیوی کہتی ہیں کہ یہ بڑا سخت مرض ہے ۔
عزیز ۔ اگر ہرج نہ ہو تو مجھے بھی دیکھ لیجئے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دماغ میں گھن لگ گیا ہے ۔
ڈاکٹر ۔ (علیحدہ) تبدیل خاندان کرو (ہنسکر) اور کوئی باقی ہے ۔ محلہ میں بھی دریافت کرا لیجئے ۔

[ہر ایک کو جلدی جلدی دیکھتا ہے نسخہ لکھتا ہے اور پرچوں کو اکٹھا کرکے عزیز کے ہاتھ میں دیدیتا ہے ۔ پھر بیگ اٹھاتا ہے اور وہاں سے ہوا ہو جاتا ہے ۔ عزیز اُس کے جانے کے بعد نسخوں کی تقسیم کرتے ہیں اور کنیزہ کو اس کے نسخے کے ساتھ رفن کا نسخہ بھی دیدیتے ہیں]

عزیز ۔ (نسخہ دیکر) احتیاط سے رکھئے گا ۔

لطیفہ۔ مینا دوڑ! دوڑ! یہ دوا گرمی تو نہ کرے گی۔ [مینا دروازے کی طرف لپکتا ہے]

کنیزہ۔ رک رک! (مینا رک جاتا ہے) پوچھتے آنا کہ میں کیا کھاؤں؟ (مینا لپکتا ہے)

سعیدہ۔ ارے او بہرے، ہے ہے سنتا ہی نہیں، (مینا پھر واپس آتا ہے) میں خربوزے کھاؤں کیا (مینا پھر لپکتا ہے)

کنیزہ۔ (دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑتی ہے) خربوزوں کو میرے لئے بھی پوچھ لینا۔

[اسی اثنا میں موٹر سے ہارن کی آواز آتی ہے۔ اور پہیوں کے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔]

لطیفہ۔ (مضطرب ہو کر) لو ڈاکٹر گیا۔

سعیدہ۔ سب مریض بن گئے تھے۔ اس گھر میں بیماریاں اُبل پڑی تھیں۔

کنیزہ۔ ڈاکٹر بھی جراثیم کی پوٹ ہے اس کے آنے سے پہلے سب اچھے خاصے تھے۔

سعیدہ۔ تم ہی بیچاری ایک مریض تھیں۔ شاید رفن بھی تندرست تھا۔

کنیزہ۔ میرا تو شاہانہ مرض ہے۔ اختلاج قلب۔

سعیدہ۔ لسنخول کی ہوا پھانکتی رہو۔ تندرست ہو جاؤ گی۔ کوئی ٹکٹ جمع کرتا ہے۔ کوئی تتلیاں جمع کرتا ہے۔ ہماری بہن صاحبہ کو

نسخہ جمع کرنے کا شوق ہے خدا خیر کرے۔

کنیزہ۔ ہم کوئی سدا روگی تھوڑی ہیں جو ہر وقت مُنہ سے شیشی لگی رہے۔

سعیدہ۔ پھر کیوں ڈاکٹروں کے سامنے پیش پیش رہتی ہو۔

کنیزہ۔ (غیض غضب میں) آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئیں۔ نوج میں نے آپ کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ موا کمپونڈر کی دُم۔ لیجیئے اپنا نسخہ (ایک نسخے کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے) میں ایسے ویسوں کی خود دوا نہیں پیتی۔

(دوسرا نسخہ عزیز کو دیتی ہے) لو رفن کا نسخہ خود رکھو۔

عزیز۔ (نسخہ پر نام پڑھ کر) لو غضب ہو گیا۔ (پھٹے ہوئے نسخے کے ریزوں کو اٹھاتا ہے) ارے یہ رفن کا نسخہ تھا۔ رفن کا۔ اسے آپ نے پھاڑ ڈالا۔ میری شامت اعمال تھی کہ آپ کو احتیاط سے رکھنے کو دیا۔ (سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر) بھئی ان سب نے تو ہم کو دیوانہ اور پاگل بنا دیا ہے، دماغ کو گھن لگ گیا ہے جس مریض کیلئے خاص طور پر ڈاکٹر بلوایا گیا وہی بلا دوا کے رہیگا۔ بار الٰہا (آسمان کی طرف دیکھتا ہے) اگر تیرے خزانہ میں عقل کا سٹاک ختم ہو گیا ہو تو یورپ کی عورتوں سے تھوڑی سی چھین کر ہماری ہندوستانی بہنوں میں سے ہر پردہ دار کو حصہ رسد بانٹ دے۔ ورنہ دوسرے جنم میں ہم مردوں کو یورپ کی سرزمین میں پیدا کر۔ خواہ کسی شکل میں۔

(ڈراپ) ـــــــــــــــــ (عصمت)

داڑھی

۱

یوں تو عرصہ دراز سے ہم داڑھی کے لذیذ دسترخوان پر مرہون ضیافت ہوتے ہیں اور اس اہم عنوان پر منہمک تحریر ـــــ لیکن خاص طور سے ہم چند ماہ قبل اس کے متعلقات پر اپنی تحقیق و تفتیش کو ختم کرکے اپنی زریں معلومات کو چھاپے خانے کی نذر کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اسی ماہ کے نیرنگ خیال میں پروفیسر غلام سرور صاحب ایم۔ اے کے اسی مضمون پر ایک بسیط علمی مقالے کو دیکھ کر قریب تھا کہ ہم بیہوش ہو کر ہوش میں آجائیں کیونکہ یہ مسئلہ اب وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک ہی ایجاد کے دو دعویداروں کی صورت اختیار کر چکا ہو۔ مگر اس خصوصیت کے ساتھ کہ ان میں سے ایک کو (Patent) حق آشکارہ مل چکا ہو اور دوسرے کی سعی ہنوز میدان عمل سے مستغنی رہی ہو، اور صرف خیال ہی کی حد تک محدود ہو۔ البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ مسئلہ زیر بحث پر "خامہ فرسائی" کا خیال ہم دونوں میں سے کس کے دماغ میں پہلی بار جاگزیں ہوا،

قطع نظر اس سے کہ یہ فرسودہ داڑھی رسالوں کے چہروں پر اب سے قبل صدہا بار نمودار ہو چکی ہے۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ چونکہ پروفیسر صاحب مذکور میرے کسی زمانے میں اُستاد شفیق رہ چکے ہیں اس لئے میں داڑھی کے حق اولیت سے دست بردار ہوتے ہوئے اس مضمون کو ان کے مقالے کے ضمیمے کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس عنوان کے استعمال کی جسارت پر معافی چاہتا ہوں۔

جس طرح زراعت اور باغبانی کا ذوق ہر دل میں ایک فطری جذبہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح داڑھی اُگانے کا شوق بھی ہر نوجوان کے دل میں ودیعت کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان بچّوں کی طرح جو زمین میں بوئے ہوئے بیجوں کو قبل از وقت کرید کرید کر دیکھا کرتے ہیں تمام نوجوان اپنے رخساروں پر استرے کا ہل چلاتے ہیں تاکہ زمین جلد از جلد زرخیز ہو جائے اور پھل پھلا کر بال نمودار ہوں۔ داڑھی کے موافقین اس تمہید سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ داڑھی اُگانے کے فطری جذبے کو داڑھی کٹوانے اور صاف کرانے کے غیر فطری عمل سے کیوں دبا دیا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں میں ان حضرات کی خدمت میں بصد ادب عرض کروں گا کہ یہی اعتراض کاشتکاروں پر بھی عاید کیا جاسکتا ہے جو پختہ اناج کی فصل کو کاٹ کر زمین کو برابر کر دینے کے مجرم ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ہر روز اور وہ ہر فصل پر اُس عمل کی تکرار کرتے ہیں۔

نوجوانوں کو داڑھی اگانے کا شوق مختلف تحریکات کی بنا پر ہوتا ہے۔

اوّلاً نقّالی ۔ بندر سے لے کر انسان تک تمام جانور فطرتاً اداکار اور نقال واقع ہوئے ہیں اگر نقالی معیوب ہے تو تہذیب، تمدن، فیشن، اور سماجی تنظیم سے بیک وقت دست برداری کرنا پڑیگی۔

دوئم۔ جدّت ، ہر جدید تجربہ ہزاروں لذتوں کا حامل ہوتا ہے۔ گالوں پر استرے کا پہلی بار اتصال وجدانی اور ہیجانی چیز ہے جس کو کسی دوشیزہ کے پہلے پیار سے نسبت دی جاسکتی ہے۔ پانی کی شفاف سطح پر سے کائی کا ہٹنا چمکتے ہوئے سورج کے چہرے سے ابر کی کالی چادر کا پھٹنا۔ تاریک اور گنجان جنگل میں یکبارگی بجلی کا تڑپنا۔ کسی شعلہ رو کے چہرے سے نقاب کا سرکنا یا بارش کے پہلے پانی کا گرد آلود پتوں پر گرنا اور کسی نوجوان کا پہلی بار شیو کرانا تاثرات اور جذبات کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اگر ہمارا یہ فعل گناہ ہے تو ہم تجدید گناہ کے مرتکب ہیں تخلیق گناہ کے نہیں کیونکہ آدم اور حوّا ہم سے قبل گیہوں پر اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔

سوم۔ فطرت کی تحریک ۔ فطرت نے انسان کے رخساروں میں مخصوص صبیت سے اعصاب کا ایک باریک اور نازک جال بچھایا ہے جن کی وجہ سے ان کی سطح بیحد حساس واقع ہوگئی ہے۔ عالم شباب میں یہ حس بھی شباب پر ہوتی ہے اور نوعی و جنسی خواہشات کے مرکز کی مددگار بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اس خاص عمر میں فطرت تحریک پیش کرتی ہے جس کو کسی طرح ٹھکرایا یار د نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا واحد علاج جنس مخالف کے رخساروں کا اتصال ہے۔ جس کی غیر موجودگی میں استرا کار آمد ثابت ہوتا ہے گویا یہ ہیجان طبع کے لئے تنقیہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح گرم جسم کے لئے ٹھنڈے پانی کا غسل یا دھڑکتے ہوئے قلب کے لئے عرق گلاب۔

چہارم۔ بزرگی کا شوق۔ "ابھی بچے ہو" کے تازیانے اس عمل کو تیز تر انجام دینے کے محرک ہوتے ہیں۔ اول بار شیو کے سامان کی خریداری کا اہتمام اور اس کے متعلق معلومات کا انصرام آپ غیر ضروری خیال فرمائیں لیکن اس کاشتکار کے دل سے پوچھئے جو اپنے کھیت، کی پہلی فصل کاٹنے جارہا ہو مگر افسوس ہے کہ یہ تاثرات دیر تک قائم نہیں رہتے۔

شیو کی دلچسپی نئی دلھن اور نئی ڈگری کی طرح چند ہفتوں تک مسرّت کا واحد ذریعہ رہتی ہے اس کے بعد ایک خوشگوار فرض میں تبدیل ہو جاتی ہے کچھ عرصے کے بعد ملیریا سے مدافعت کے لئے کونین کی گولی کی طرح کڑوا فرض بنجاتی ہے۔ کم و بیش ایک سال میں امتحان کے پرچوں کی طرح سر پر سوار ہو جاتی ہے اور اس کے بعد تمام عمر ایک زبان دراز بیوی، اسکول کی ماسٹری اور لوکل بورڈ کی نوکری کی طرح بلائے ناگہانی بنی رہتی ہے۔ مرد تسمہ پا اس سے کہیں بہتر ہے جس طرح ایک عاشق ہجراں نصیب کہتا ہے کہ عمر بھر میں مجھ پر دو کٹھن وقت

پڑے ہیں۔ اک ترے کے نے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد۔ اسی طرح داڑھی کے بیمار عرض کرتے ہیں کہ اعصاب کی سکرات کا وقت صرف ایک ہی ہوتا ہے اور وہ شیو کرنے کے دوران ہیں۔

مگر اس سخت امتحان کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب دینے کے لئے میں آج کل کے نوجوانوں کو بالوں کے مجاہد کی حیثیت سے پیش کرونگا۔ یقیناً جس چیز کو دور کرنے کیلئے اس قدر زحمت اور تکلیف برداشت کی جائے اس کا نتیجہ بھی اسی حد تک خوشگوار ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ داڑھی صاف کرانے کی رسم بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ ورنہ اس کے مابعد نتائج اگر مفقود ہوتے تو آج ہر جگہ انسان "جھل جھل" نظر آتا۔

مجھ سے اگر آپ یہ دریافت فرمائیں کہ دنیا میں کونسی ایسی شے ہے جس سے تم کو بے انتہا مسرت ہوگی تو میں اس چالاک فقیر کی طرح ایک مخصوص پیرایہ میں عرض مطلب کرونگا جو اسی قبیل کی صدا لگاتا ہے کہ ——— "دولت نہیں مانگتا۔ "ناول نہیں مانگتا"۔ لباس نہیں مانگتا سینما نہیں مانگتا، بس ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ "استرہ" ہے۔ مجھ کو شیو کرنے کے بعد جو اطمینان اور فارغ البالی نصیب ہوتی ہے اس کے سامنے دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔ بس مجھکو شیو کر لینے دو۔ اور تم میرے عزیز ترین دوست ہو۔ واللہ اس وقت طبیعت میں جوش ہوتا ہے دل میں امنگ ہوتی ہے جسم میں ایک برقی رو دوڑتی ہے سارا عالم تھرکتا، ناچتا اور ہنستا

نظر آتا ہے۔ قہقہوں کی آمد ہوتی ہے۔ آورد نہیں ــــ یہی وجہ ہے کہ میں مضمون نگاروں اور شاعروں کے لئے شیو کو اسی طرح ضروری سمجھتا ہوں جس طرح دل کو۔۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو نوکریوں کی تلاش اور سفارشوں کے شکار رہیں اپنے افسروں کی قدمبوسی حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے اس بات کا علم ضروری ہے کہ "صاحب" کس وقت شیو کرتے ہیں۔

ڈاڑھی کی کھونٹیاں کھیت میں جوار کی کھونٹیوں کی طرح تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ شکار کے شائقین اس میں ٹھوکریں کھا کھا کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح گال کی کھونٹیاں نہ صرف ہاتھوں کو تکلیف دیتی رہتی ہیں بلکہ دماغ پر افسردگی اور جسم میں سنسنی بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات شرارت کی تحریک بھی پیش کرتی ہیں ایسی صورت میں گھر کے ننھے۔ بھولے اور معصوم بچوں اور نیک بیویوں کے نرم گال تختۂ مشق بنائے جاتے ہیں۔ گرمی کے زمانے میں جس وقت ہر بن مو سے پسینہ کی تلیاں بہہ رہی ہوں آپ کسی نرم جلد پر اپنی ڈاڑھی کا برش پھیر کر دیکھ لیجئے ایک چیخ آسمان اور ایک چیخ زمین نہ ہو تو میرا ذمہ۔

اس کا سائنٹفک پہلو پیش کرنے کے لئے مجھ کو تھوڑی تمہید اٹھانا پڑیگی اور وہ یہی کہ انسان کے جسم پر بال کس لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ موجودہ انسان بحیثیت مجموعی حیوانات کی ارتقائی صورت کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نسبتہً زیادہ مہذب، حساس اور ذکی الحس واقع ہوا ہے اسی ارتقاء

دماغ کے شانہ بشانہ بالوں کی پیداوار میں انحطاط واقع ہو رہا ہے۔ پست درجہ کے جاندار بالدار ہوتے ہیں تاکہ وہ موسم کی ستم ظریفیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ گرد و غبار کے ماحول میں پرورش پانا گویا بالوں کو دعوت نمو دینا ہے۔ اس کے برخلاف موجودہ زمانہ کا مہذب انسان بلاناغہ غسل کرتا ہے اور اپنے خون کا معتد بہ حصہ دماغی نشو و نما میں صرف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضلہ کم تعداد میں پیدا ہوتا ہے اور جلد کے بالوں کی پیداوار میں تیزی ناپید ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ البتہ ایسا تھا جس میں انسان اپنے سے کمزور پر خوف و جلال طاری کر کے حکومت کرتا تھا۔ اسی لئے فیملی میں ریشیائیں بزرگ سے عورتیں اور بچے بھی خائف رہتے تھے۔ آج کل خوف کے بجائے الفت و محبت نے لے لی ہے اس لئے اس ہتھیار کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ شیو کے اس مسلسل عمل سے ممکن ہے کہ بالوں کی نمو مفقود ہو جائے اس مقام پر ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ مرد کے بال جسم کے اندرونی غدودوں کے سیال مادے سے قوت نمو حاصل کرتے ہیں۔ فی الحال میں اس کو رد نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ آئندہ زمانے میں یہ نظریہ بھی کشش ثقل کے مسئلہ کی طرح غلط ثابت ہو جائے۔ بہر حال مردوں کا عورتوں کی طرح داڑھی اور مونچھوں سے آزاد ہونا طرفین میں محبت کی بنیاد کو استوار کرتا ہے اور اس لئے ایک عمل صالح ہے اور آرٹ کی تقلید میں سعی لطیف۔

فی زمانہ شیو کرو اور شیو کرنے دو سوسائٹی کا ایک نہایت اہم اعلان ہے جس کی

اطاعت ہم پر ضروری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ذیل کے لوگوں پر۔

(۱) جن کے بال روس کی آبادی کی طرح ایک عدد فی مربع میل ہوں۔

(۲) جن کے گال بالوں سے فطری طور پر مستغنی ہوں۔

(۳) جو سسرال میں دکھوا جانے والے ہوں۔ یا سرکاری ملازمت کے امیدوار ہوں۔

(۴) جن کی داڑھی کے بال تجربہ کار ہو چکے ہوں۔

وہ حضرات جو اس سے متفق نہیں نہ صرف سوسائٹی کے احکامات کو پس پشت ڈالتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فطرت کے حکم سے بھی شان استغنا برتتے ہیں آرٹ کی گردن پر چھری پھیرتے ہیں اور جنس لطیف پر ظلم۔ ایسے لوگوں کا تجزیہ حسب ذیل طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ "غربت"۔ شیو کرنے کا سامان خریدنا یا حجام کی اجرت دینا امکان میں نہیں۔

۲۔ "کاہلی"۔ زحمت سے بچنا چاہتے ہیں اس لئے عید کی رات ہی کو غسل کرتے ہیں

۳۔ "سیاست"۔ خادم کعبہ یا مولانا کا خطاب حاصل کرنے کے لئے یہ پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ عبا، قبا، جبہ و دستار کی پوشش کے ساتھ داڑھی رکھی نہیں جاتی بلکہ پہنی جاتی ہے لباس کی طرح اور لٹکائی جاتی ہے تسبیح کی طرح۔

۴۔ "جہالت"۔ تنگ نظری، تعصب، ضد اور جہالت کا پردہ آنکھوں پر پڑا رہتا ہے اور چہرے پر نمایاں۔ زندگی کی لطافتیں خود پر حرام کر لیتے ہیں اور دوسروں پر بند۔ علی گڈھ کی فضا میں آنکھ کھلتی ہے اور یہ خودرو پھپھوندی دور۔ وگرنہ آستانہ

عروس پر مُنہ دکھائی کے وقت اس کا چڑھاوا چڑھانا ہی پڑتا ہے۔

۵۔ "چہرہ کشی" خودکشی کا دوسرا نام ہے۔ جو نوجوان دنیا کی ستم ظریفیوں سے تنگ آجاتے ہیں اور زندگی سے بیزار وہ خودکشی پر آمادہ ہوجاتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ ہمت مفقود ہے تو داڑھی رکھ لیتے ہیں۔ گویا اس طرح وہ داڑھی کی نقاب ڈال کر دنیا سے روپوش ہوجاتے ہیں اور اس کی مسرتوں سے محروم،

۶۔ "پیری" جب قواء مضمحل ہوجاتے ہیں اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا تو گوشہ نشینی کے ساتھ جہاں دوسری لذتوں سے کنارہ کشی کی جاتی ہے وہیں شیوے بھی دست برداری کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے مجبوری ہے اور قابل معافی۔

۷۔ "اتقا" ایسے بزرگ جو خالصاً لوجہ اللہ داڑھی رکھتے ہیں اور خدا کی اس نعمت پر سجدہ ریز ہوتے ہیں یقیناً قابل احترام ہیں۔ اس مضمون میں ہمارا روئے سخن ان کی طرف واللہ باللہ نہیں ہے۔

۲

ناانصافی ہوگی اگر داڑھی کے ضمن میں موچھوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کی ذہنیت پر مجھ کو بیحد افسوس ہوتا ہے جو باوجود اس کے کہ داڑھی کو ہضم کرجاتے ہیں لیکن اس کی دم کو موچھوں کی شکل میں باقی رکھ کر مردانگی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں اور ان پر خاص طور سے استہزاء کرتے ہیں جو اس ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے

رہیں تو دونوں باقی رہیں وگرنہ ایک بھی نہ رہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک کی غیر موجودگی میں دوسری سوگوار نظر آتی ہیں، بہتر ہو کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور آئندہ سے صرف ایک کلّے کا شیو کیا کریں اور دوسرے کلّے پر داڑھی اُگائیں۔

طبیّ نقطۂ نظر سے ہم یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ موچھیں بہ نسبت داڑھی کے زیادہ خطرناک ہیں۔ اظہر من الشمس ہے کہ

(۱) ان کے بالوں کے جراثیم اشیاء خورد و نوش کو زہریلا بناتے رہتے ہیں۔

(۲) نتھنوں پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ پردہ معلوم ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت میں دقت محسوس ہوتی ہے۔

(۳) ہونٹ جیسے لطیف عضو پر بے جا دباؤ ڈال کر گفتگو کی روانی میں مخل ہوتے ہیں۔ یہی وجوہات ہیں کہ موچھیں بذات خود شارع کی نگاہوں میں بھی کھٹک گئیں، اور ان کی صفائی مستحب قرار دیدی گئی اور داڑھی کی حرام،

کیا ریاضی کے اس معمولی مقالے سے معترضین کو اتنی بھی واقفیت نہیں کہ موچھوں کی صفائی داڑھی منڈوانے کے گناہ کو ہلکا کر دیتی ہے۔

البتہ جو لوگ موچھوں کو پر قینچ کر کے مختلف اصلاحیں عمل میں لاتے رہتے ہیں وہ کسی حد تک قابل الزام ہیں لیکن از روئے انصاف وہ بھی بری الذمہ قرار دیئے جاسکتے ہیں کیونکہ وہ بذاتِ خود اس کے ذمہ دار نہیں بلکہ استرہ مورد الزام ہے۔ کیا آپ کو اس بندر کی کہانی یاد نہیں جو بلیوں کی روٹی کو ترازو کے دونوں پلّوں

میں رکھ کر انصاف کرنے بیٹھا تھا اور ان کو مساوی رکھنے میں ناکام رہ کر سب ہضم کر گیا تھا۔ بعینہٖ یہی حادثہ ہمارے چند دوستوں کو بھی پیش آتا ہے۔ ہاتھ ہی تو ہے جو بلا ارادہ حرکت کر جاتا ہے اور دونوں طرف کی مونچھوں کو مساوی الاضلاع مثلث بنانے میں اکثر اوقات کامیاب نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف کتر، بیونت کی جائے تو دوسری طرف بھی انصافاً وہی عمل دُہرانا پڑتا ہے تا اینکہ مجبوراً بنائے فساد کا خاتمہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے خوبصورت چہرے کو سینما کا مزاحیہ سین بنا دیں؟

پوچھ لیجئے کسی ایسے نو وارد سے جو موچھ منڈا کر بچھڑوں میں داخل ہوا ہو۔

۳

دنیا میں دو چیزیں جس قدر پرانی ہوتی جاتی ہیں اسی قدر عزیز تر ہوتی جاتی ہیں

(۱) بے کاری

(۲) اُسترہ

یہی وجہ ہے کہ میرے اکثر دوست اور مہمان مجھ سے محض اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں کہ میں ان کی خاطر تواضع اپنے استرے سے نہیں کرتا حالانکہ ان کے قدموں کے لئے مجسم قالین بن جاتا ہوں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ استرہ اور گھوڑا دو جانور ہیں جو وفاداری اور شرافت میں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں اور نزاکت طبع میں ایک دوسرے سے بڑھے چڑھے ہوئے۔ ان کی مزاج شناسی کچھ سہل نہیں ہے،

بدیں وجہ غیر کی ران کے نیچے گھوڑا بالکل ٹٹو بن جاتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں استرہ گھاس کاٹنے کی کھرپی۔ رواں استرہ کہربائی قوت رکھتا ہے جس کے سامنے شعر کی گرمی اور پانی کی روانی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

میں نے استرے کے لئے جانور کا لفظ استعمال کیا ہے اور صحیح استعمال کیا ہے۔ ہر وہ چیز جو جان اور حیات کی مالک ہو جانور کہلائی جا سکتی ہے۔ علم حیات کے مشہور پروفیسر سر جگدیش چندر بوس نے حال ہی میں یہ ثابت کیا ہے کہ حیاتیات کے شعبہ میں نہ صرف حیوانات و نباتات شامل ہیں بلکہ ان میں جمادات بھی شامل ہیں۔ کوئلہ۔ پتھر اور لوہا وغیرہ جمادات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بظاہر اس وجہ سے کہ وہ ساکن ہیں اور جامد لیکن ارباب بصیرت کی نظروں میں وہ متحرک ہیں اور حساس۔ مثلاً استرے ہی کو لے لیجئے کہ بعض اوقات وہ بلا کسی ظاہری سبب کے چلتے چلتے کند ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح ایک مضمون نگار کا دماغ۔ اس خاص موقع پر لوہے کے استرے کو اور مضمون نگار کے دماغ کو لاکھ سلی پر رگڑیں اور اڈیٹر کے سالنامے سے خوف دلائیں مگر وہ دونوں ٹس سے مس نہ ہونگے ان کا واحد علاج یہی ہے کہ انھیں آرام کرنے دیا جائے تاکہ ان کے کہربائی ذرات اسی ترکیب سے ترتیب پا جائیں کہ صورت سابقہ پر آجائیں گویا استرہ بھی مضمون نگار کے دماغ کی طرح تھک جاتا ہے آرام لیتا ہے۔ سوتا ہے بیدار ہوتا ہے اور پھر حسیت و چالاک ہو کر مشین بن جاتا ہے۔

اس ٹھوس سائنٹفک ثبوت کے بعد اسٹر کے ذی حیات ہونے میں اگر کچھ شک باقی رہ گیا ہو تو ہمارے اسٹر کے عادات و اطوار کا معائنہ اس کو رفع کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا اس کی چند خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں۔

(۱) مجھ سے بے انتہا موانست کی وجہ سے وہ غیر کے ہاتھ میں جا کر اس قدر ناراض ہوتا ہے کہ گالوں کو کاٹ کھاتا ہے۔

(۲) میری طرح وہ بھی وقت کا بے انتہا پابند ہے حسب دستور صبح کے آٹھ بجے تیز اور رواں رہتا ہے۔ مگر دن کے دوسرے اوقات میں رات کے جاگے ہوئے چوکیدار کی طرح نیم خواب،

(۳) اتوار کے دن پوری تعطیل مناتا ہے کیونکہ میں خود دن کے بارہ بجے بیدار ہوتا ہوں اور بقیہ دن گھر کے اندر ہی گزارتا ہوں۔

(۴) نزاکت طبع میں بھی وہ میرا ہم پلہ ہے موسمی تغیرات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً برسات میں مرطوب ہوا موافق نہیں آتی۔ چہرہ مکدر ہو جاتا ہے اور سوء ہضم کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ ایسا مزاج شناس اسٹرہ مجھ کو کس قدر عزیز ہوگا مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس کی یہ خصوصیات اس مضمون کی تحریر کے چند ماہ قبل تک تھیں مگر اب صورت حالات بدل چکی ہے۔ یہ ولایتی النسل اپنی اصل پر گیا اور ہندوستان کی عیش افزا آب و ہوا سے متاثر ہو کر

چھ سال متواتر محنت و جانفشانی سے اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کے بعد لگا بانکپن دکھانے اور سکول و کالج کے لڑکوں کی طرح ہنگامی تعطیلات منانے ۔

میرے لیئے کند استرہ مصیبت عظمیٰ ہے کیونکہ اس کا نان کوآپریشن یہی ہے کہ ایک طرف کی داڑھی صاف کردے اور دوسری طرف انداز معشوقانہ دکھائے بہرحال میں نے سلّی پر تادیب کی اور چمڑے سے گوشمالی لیکن میرے استرے کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم شیو کرنے کے بعد جب باہر نکلتے تھے تو لوگ ہمارے چہرے کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ کیا تمھاری داڑھی میں دیمک لگ گئی ہے ۔

اندریں حالات یا تو اسے پنشن دی جاتی اور ایک تازہ دم استرے کا تقرر کیا جاتا یا مارشل لا کا نفاذ کر کے اس کو سان پر چڑھا دیا جاتا اور یا اس کو بڑی تعطیل دے کر خلیفہ جی کی عارضی خدمات حاصل کی جاتیں مگر مجبوری تھی کہ میری سیاست متذکرہ صورتوں میں سے کسی ایک کی طرف بھی راغب نہ ہوئی ۔ کیونکہ استرے پر سان رکھوانا عالم پیری میں عذود بدلوانے کی طرح ہے ۔ خلیفہ جی سے رجوع کرنا بد مذاقی کی دلیل ہے اور اصول صحت کے منافی ۔ دوسرے شیو کرانے کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ منہ دھوبی کے یہاں بھیجدیا جائے ۔ نیا استرہ خریدنا بہت اہم کام ہے اور پرانے استرے سے قطع تعلق ستم ——— بر کی تلاش کے لئے نجیف الطرفین کی ضرورت ہوتی ہے جو فی زمانہ عنقا ہے اور نئے استروں میں

تیز ہتھیار کی تلاش کرنا بیسود کیونکہ اچھا استرہ قسمت سے ملتا ہے حکمت سے نہیں۔

اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے مجھے بمبئی کی سائنس کانگریس میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں میرے دیرینہ کرمفرما ..... ! یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر حیات ڈاکٹر ..... سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنا استرہ پیش کرتے ہوئے اس کے حالات بے کم و کاست بیان کر دیئے چونکہ یہ کیس بظاہر دلچسپ معلوم ہوتا تھا اس لئے پروفیسر مذکور نے کانگریس کی ایک نشست میں اس اہم مسئلہ کو بھی پیش کر دیا۔ فاضل پروفیسروں نے جن میں ڈاکٹر ..... ڈی۔ ایس سی ایس، سی، ڈی آف ..... یونیورسٹی اور ڈاکٹر ..... آف ..... یونیورسٹی جیسی ہستیاں تھیں مجھ کو طلب کیا اور مختلف سوالات کرنے کے بعد استرے کو مختلف تجارب کے لئے تجارب گاہ روانہ کر دیا۔ وہاں سے تقریباً ایک ہفتہ کے بعد سکریٹری نے مجھے تار کے ذریعہ سے طلب کیا اور یہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

" ابو طاہر صاحب کے استرے نے دنیائے سائنس میں ایک تہلکہ ڈال دیا ہے اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عرصہ قریب میں علم حیات پر تمام لٹریچر کو از سر نو مرتب کرنا پڑیگا اور استروں کے معاینہ اور تجربہ کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کرنا پڑیگا۔ جس میں داخلہ کے وقت " اصلاح خانوں " کے ڈائرکٹروں کو خاص طور سے مراعات دی جائینگی۔

بحوالہ نظریۂ سر جگدیش چندر بوس زیر غور استرہ مکمل حیات کا مالک ہے اور اپنے ارتقائی مدارج کو بسرعت تمام طے کر رہا ہے۔ ڈارون کا وہ نظریہ ارتقاء جس کو موجودہ زمانہ میں غلط ثابت کیا جا رہا تھا از سر نو زندہ ہو گیا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ موجودہ انسان نتیجہ ہے بندروں کے ارتقاء کا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس پیچیدہ مسئلہ کا حل بھی دریافت ہو گیا ہے جس کی رو سے مخالفین کے لئے راہِ فرار مسدود ہو گئی ہے آسٹریا کے مشہور پروفیسر ڈی ویریز نے ایک بار نظریہ میوٹیشن کی رو سے یہ ثابت کیا تھا کہ بہت سے ذی حیات اجسام ارتقائی مدارج کے برخلاف اپنی صورت یکبارگی تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس استرے کے معاینہ کے بعد اس نظریہ کا ثبوت بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے کیونکہ مستقبل قریب میں ہم امید کرتے ہیں کہ اس استرے کا جسم اپنے موجودہ ہیولی کو تبدیل کر کے یکبارگی حیوانی صورت اختیار کر لیگا اور دنیائے حیات میں ایک نئی قسم کے جانور کا اضافہ کریگا۔ فی الحال اس کے عادات و خصائص اور شکل و صورت پر بحث ناممکن ہے۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ گوشت پوست سے مرکّب لوہے سے ملتا جلتا ایک پرندہ ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک تتلی ہوتی ہے درخت کے سوکھے ہوئے پتے کی شکل کی۔ اپنے ماحول کے زیر اثر یہ بالوں کی خوراک ہی پر اپنی زندگی بسر کریگا اور اس کا مقصدِ حیات رخساروں کے لالہ زار لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی صفائی ہوگا۔ اس کی نسل بہت تیزی سے پھیلے گی اور ایک عرصے کے بعد

ٹڈیوں کے دل بادل کی طرح ان کا جتھا بالوں کے کھیت کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جائیگا۔ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں سر کے بال ٹوپی سے محفوظ رہیں تو رہیں۔ وگرنہ داڑھی اور مونچھوں کے بال ناپید ہو جائیں گے۔ البتہ مولویوں، پادریوں اور دوسرے بزرگوں کے لئے سخت مشکل کا سامنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ان کی صدائے احتجاج پر کتّے اور دوسرے جانوروں کی طرح اس جانور کے ازدیادِ نسل پر بھی گورنمنٹ کی طرف سے کچھ پابندیاں عاید کردی جائیں۔

ایسی حیرت انگیز تبدیلی کی مدت تقریباً چار یا پانچ سال ہوگی۔ اس عجیب غریب آلہ کے کُند ہونے کا سبب معلوم کرنے کے ضمن میں ہم پر ایک دوسرے حیرت انگیز واقعہ کا انکشاف ہوا اور وہ یہ کہ اس میں جنسی خصوصیات بھی نباتات کی طرح بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دراصل زیرِ غور استرہ مذکر نہیں ہے بلکہ مونث ہے تعجب ہے کہ چھ سال کی مدّت میں اس نے اپنی افزائشِ نسل میں کوشش نہیں کی۔ اس کے خوش قسمت مالک کے بیان پر معلوم ہوا کہ اتفاقاً یہ استرہ تنہا ہی رکھا یا رکھی گئی۔ اگر حجّام کی کسوت میں ہوتا تو مذکر استروں کے اتصال سے ضرور کچھ نہ کچھ نتیجہ برآمد ہوتا۔

ڈاکٹر جھنا کا بیان ہے کہ اس استرے کے کند ہونے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ حاملہ ہو چکا ہے۔ ان کے پاس اس کے باور کرنے کے لئے بہت سے ثبوت ہیں۔ لیکن دقّت یہ ہے کہ ہم اس موجودہ حالت میں

اس پر کسی قسم کا کیمیاوی عمل نہیں کر سکتے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم اس بیان کو صحیح مان بھی لیں تو بھی ہم کو استقرار حمل کے لئے کوئی دوسرا اسباب تلاش کرنا پڑیگا کیونکہ اس کے مالک کے بیان پر یقین کرتے ہوئے ہم اس کا جنس مخالف سے اتصال ثابت ہی نہیں کر سکتے۔ اس مقام پر ڈاکٹر رفیق نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بھی دلچسپ ہے اور قرین قیاس وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ طرفین میں رشتہ قائم کرنے کی محرک کوئی دوسری شے ہو ہی نہیں سکتی مگر پتھر کی سلی۔ کیونکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ پھولوں میں مادہ حیات کا تبادلہ جسمانی اتصال سے معرض وجود میں نہیں آتا بلکہ اکثر اس تحریک کی موجب ہوا، پانی اور شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہی سلی پر مختلف قسم کے استروں کا اتصال بھی مذکورہ نتیجہ کا سبب بن سکتا ہے۔ بہر حال اگر یہ امر واقعہ ہے تو اس کے نتائج کے لئے تقریباً ایک سال تک انتظار کرنا پڑیگا۔ ہم اس کے خوش قسمت مالک سے اس حیرت انگیز نمونے کو دنیائے سائنس کے فائدے کے لئے طلب کرتے لیکن دقت یہ ہے کہ اگر اس سے حسب معمول شیو کا کام لینا بند کر دیا جائیگا تو یقیناً جس طرح دوران خون بند ہو جاتا ہے اسی طرح اس کے ذرات کی حرکت بھی بند ہو جائیگی اور ایسے نازک موقع پر اس کی متذکرہ بالا تبدیلیوں پر بھی اثر پڑیگا۔ ممکن ہے کہ بالو کی خوراک نہ ملنے سے یا بالوں کی رگڑ سے کہربائی قوت نہ حاصل ہونے سے جامد بن جائے۔

بہرحال اس ایک شہادت سے زنجیر ارتقاء کی تمام کھوئی ہوئی کڑیوں کا سلسلہ
مل چکا ہے اس لئے ہم بہانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ۔

(۱) مادہ کی تقسیم باعتبار جمادات، نباتات اور حیوانات غیر فطری ہے۔

(۲) نظریہ ارتقاء کی رو سے حیوانات نتیجہ ہیں نباتات اور جمادات کی تدریجی
یا یکبارگی ترقی کا۔

(۳) ذی حیات اور مُردہ اجسام میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اول الذکر نتیجہ ہے
ذرات کی حرکت کا اور آخرالذکر سکون کا۔

ان حیرت انگیز انکشافات پر میں سراپا حیرت و استعجاب بن گیا۔ مجھ کو اس
خیال سے بیحد مسرت ہوئی کہ جس طرح آئین شٹائن نے نظریہ اضافت سے دنیائے
سائنس میں تہلکہ ڈال دیا تھا میں بھی اس یہودی پروفیسر سے کسی طرح کم ثابت
نہ ہونگا۔ لیکن جس وقت مجھے اپنے نامکمل شیو کا اور اس کے مابعد اثرات کا خیال
آیا تو میں بیحد ملول ہوا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ زندہ جاوید ہستی بننے سے ہزار درجہ
یہی بہتر ہے کہ خود میں دنیا میں گمنام ہوں مگر اس طرح کہ بال میرے چہرے پر
گمنام رہیں۔

اسی نقطۂ نظر سے میں نے کمیٹی کے سامنے اپنی داڑھی کی بیکسی اور کس مپرسی کی
داستان بیان کرتے ہوئے سرجری (علم جراحی) کے ماہر ڈاکٹر بھاٹیہ سے خاص طور
پر استدعا کی کہ اس آلہ میں ولایتی عورتوں کی طرح "ضبط تولید" کا مادہ پیدا کر دیا جائے

تاکہ اس میں سابقہ تیزی دوبارہ عود کر آئے۔ ڈاکٹروں نے متفق ہو کر میری اس درخواست کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ ضبط تولید کے محض اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس فطری مادّہ کو روک دینے سے عورتوں کا جسم اپنی قدرتی حدوں سے تجاوز کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ گوشت کا ایک پہاڑ بن جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں استرا بھی طویل و عریض ہونے لگتا۔ یہاں تک کہ تلوار دست پناہ یا توا بن جاتا میں نے آخری بار ایک اور التجا کی اور وہ یہ تھی کہ یورپ کے تبدیل جنسی کے کسی ماہر ڈاکٹر سے کیوں نہ اس آلہ کو مونث سے مذکر بنوا دیا جائے تاکہ اس کے فرائض کی ادائگی میں خلل واقع نہ ہو۔ میں نے اس امر پر افسوس کیا کہ اگر مجھ کو ان تمام انکشافات کا اس سے قبل علم ہوتا تو میں سلّی کو استعمال کرنے سے قبل جراثیم مارنے والی دوا سے دھو لیا کرتا تاکہ ہسپتال کی نرس کی طرح میرا استرہ ایک سال میں چند ماہ کے لئے معطل نہ ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے اس کی بھی مخالفت کی اور مجھ کو مشورہ دیا کہ بقیہ مدّت بہت احتیاط سے گذاروں اور اس استرے سے شیو کے عمل کو جاری رکھوں ورنہ دنیائے سائنس میری خود پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے ایک نادر الوجود شئے اور ایک مکمل ثبوت سے محروم ہو جائے گی۔ آخر میں انھوں نے مجھے ان تمام واقعات کے پوشیدہ اور مخفی رکھنے کی تاکید فرمائی کیونکہ اندیشہ تھا کہ یہ "بال خورہ" جسے داڑھی کا سب بھی کہہ سکتے ہیں ریش درازوں کی نگاہوں میں کھٹکے اور قبل از وقت برباد کر دیا جائے۔

بہرحال میرے استرے کی مذکورہ بالا کیفیت دنیائے سائنس کے لئے امید افزا تھی مگر میرے لئے مایوس کن۔ میں شیو کرتا رہا لیکن وہ روحانی مسرت نہ حاصل ہوئی جو اس سے قبل ہوتی تھی۔ میری طبیعت افسردہ، ملول اور پریشان رہنے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ملیریا ہے اور میرا اعتقاد تھا کہ داڑھی کے جراثیم۔

ہم ایک ماہ کامل بیمار رہے۔ ایسی صورت میں مرض کے جراثیم کے ساتھ ساتھ داڑھی کے جراثیم بھی پرورش پاتے رہے۔ آخر کار جب صحت ہوئی تو ہمارے چہرے پر خودرو داڑھی کی ایک پھل پھلائی ہوئی فصل تیار تھی جو بقول حضرت سعدیؒ گندنا کی کھیتی کی طرح تھی اور ہم باوجود صحت پانے کے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زرد ۔۔۔ استرے کے متعلق اگر آپ دریافت فرمائیں تو بصد افسوس اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اس کو جب میں نے غلاف سے نکالا ہے تو وہ ایک زنگ خوردہ اور دیمک لگا ہوا لوہے کا ٹکڑا تھا۔ دنیائے سائنس اس روح فرسا واقعہ پر جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

۴

ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے چند اٹل قوانین بنائے ہیں جو وقت معینہ پر مختلف تحریکوں کے ماتحت انسان کے مختلف فرائض کی انجام دہی کے محرک ہوتے ہیں ایسے عمل کیلئے کسی بیرونی تحریک کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہوتی مثلاً صبح ضروری

کے ایمانداری سے ادا کرنے پر نہ تو کوئی لیکچر دیتا ہے اور نہ مبسوط مقالے لکھتا ہے
شادی کا مسئلہ بھی اسی کے تحت میں آتا ہے کیونکہ عمر میں ایک خاص وقت اور خاص
موقع پر انسان کے مزاج میں فیملی رجحان پیدا ہوتا ہے اور اس وقت اس کو
اپنی روح کی تنہائی کا صحیح علم ہوتا ہے۔ یہی وقت بہترین ہے اس فطری خواہش
کی تکمیل کا ——— سار دابل کی تاخیر اور والدین کی عجلت دونوں مورد
الزام ہیں اور موجب تکلیف۔

داڑھی کا شوق بھی ایک خاص عمر میں ایک خاص جذبے کے ماتحت پیدا ہوتا
ہے۔ اس وقت جہاں اور دوسری حرکات چھوڑ دی جاتی ہیں وہاں داڑھی بھی
چھوڑ دی جاتی ہے۔ یقیناً داڑھی کی کاشت کے لئے بہترین فصل یہی ہے۔ لاریب
کہ فطرت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کیلئے بڑی سخت سزائیں ہیں۔

جہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ ہم موچھوں کے متعلقات پر ایک
ضخیم کتاب تصنیف کر سکتے ہیں کیونکہ ہم نے محض تجربتاً ان کے ارتقائی اور تنزلی
درجوں کو جنھیں فاضل پروفیسر نے داڑھی کے ضمن میں ایک ہزار سال کے تفاوت
سے بیان کیا ہے صرف چند ہی ماہ میں طے کر لیا تھا۔ لیکن سر اور داڑھی کے دونوں
پلڑوں کے توازن کو مختلف النوع حیثیتوں سے قائم رکھنے کی طرف رجوع نہیں
ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے استرے کی اجل سے دنیائے سائنس کو جو
زبردست نقصان ہوا تھا اس کے سوگ میں ہم نے داڑھی قائم رکھنے کا الٹیمیٹم دیدیا

ہمارا یہ فعل دراصل نتیجہ تھا بیرونی تاثرات کا اس لئے ہم کو قدرت نے اس غیر فطری عمل کے سرزد ہونے پر سزا دی۔ جس کی داستان ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

(۱) ملیریا سے صحت ہونے کے باوجود ہمارے خون کا معتد بہ حصّہ داڑھی کی پرورش و پرداخت میں صرف ہو رہا ہے اس لئے ہم بسرعت تمام کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ مولویوں کی طرح داڑھی لمبی ہو رہی ہے اور دماغ خشک طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی مفقود ہو رہی ہے۔ جذبۂ غضب ترقی کر رہا ہے۔ جذبات اور حسیات میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ دل مجبور کر رہا ہے کہ یا تو دعویٰ پیری کروں یا صوفی بن جاؤں۔ ہاتھوں کی پشت پر ایک لطیف خارش سی محسوس ہوتی ہے جو اس وقت دور ہو جاتی ہے جبکہ کوئی عقیدتمند بلا استثنائے جنسیت ان کو اپنے لبوں سے مس کرتا ہے۔

(۲) ٹھوڑی اور گالوں کی خلش بھی بے انتہا تکلیف دے رہی ہے۔ ریت کا غذ سے رگڑ کر چھیلنے کا ارادہ ہے میرا سیدھا ہاتھ ہمیشہ داڑھی سے الجھا رہتا ہے۔

(۳) بیگم سے جنگ چھڑ گئی ہے کیونکہ ان کو میری نسبت بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ جذبۂ انتقام مجبور کرتا ہے کہ وسعت حرم وسیع تر بناؤں۔

(۴) میرے قرض خواہوں نے نوٹس دیدیا ہے کہ میں ایک ماہ کی مدت میں تمام سابقہ تمسکات، دستاویزات اقرار نامہ جات اور قرضہ جات کو

چکادوں کیونکہ اب میں ان کی نظروں میں خطرناک قسم کا انسان ہو گیا ہوں
کیا میں اعلان کردوں کہ یہ تحریریں جعلی ہیں۔

(۵) میرے خاندان کے بہت سے بچے جب رونے لگتے ہیں تو انھیں میری زیارت کرائی جاتی ہے جس پر وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یہ وبا محلے تک پھیل گئی ہے۔ ایک عرصے کے بعد میرے مکان پر رونے والے بچوں کی ایک نمائش گاہ قائم ہو جائیگی۔

(۶) مجھ کو مولانا کا خطاب عطا ہونے والا ہے لیکن تا ہنوز گزٹ نہیں ہوا۔
فی الحال میں داڑھی کی قربان گاہ پر اپنے تمام حقوق قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن خدا کے لئے مجھ کو بتایئے کہ میں اس آخری مصیبت پر کس طرح صبر کروں۔
بھائی ملا رموزی صاحب واقعی قابل تعریف ہیں کہ ملّا اور مولانا کا جزو لینے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں لیکن میں ان کی تقلید کسی طرح نہیں کرسکتا جس طرح ان کو "منشی" کے نام سے عداوت اور بغض للٰہی ہے۔ اسی طرح مجھ کو مولانا کے نام سے کیونکہ اول الذکر اس شخص سے منسوب کیا جاتا ہے جس کو موت ہو نہ رزق۔ آخر الذکر اس شخص سے جس کے دماغ میں شئے لطیفہ کی کمی ہو۔ خدانخواستہ اس سے میرا مقصد اس خاص لفظ کی تحقیر کرنا مدنظر نہیں بلکہ مجھ کو اختلاف ہے اس کے غلط اور بے محل استعمال پر، عامتہ الناس نے اس مبارک لفظ کو ہر اس شخص کے متعلق استعمال کرنا شروع کر دیا ہے

جس کے پاس سوائے داڑھی کے سرٹیفکٹ کے دوسری قابلیتیں مفقود ہوں خداوند محفوظ رکھے تو مجھ کو دوستوں کی اس فتنہ انگیزی سے وگرنہ داڑھی سے۔

اگر میرے ناظرین میں کوئی محترم کونسل کے ممبر ہوں تو میں ان سے بصد ادب عرض کرونگا کہ خدا کے واسطے اس متبرک خطاب کو شمس العلماء کے خطاب کی طرح بحق گورنمنٹ محفوظ کرا دیجئے تاکہ اس سے ہر کس و ناکس مستفید نہ ہو سکے۔

دوسری عرض یہ ہے کہ ایک میڈیکل بورڈ کے قیام پر غور کیا جائے جو یہ تحقیقات کرے کہ موجودہ زمانہ کی آب و ہوا میں دماغی نشو و نما پر داڑھی کا کس حد تک اثر ہوتا ہے۔

آخر میں اس دُعا پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ میری طرح آپ کو بھی داڑھی رکھنے کی توفیق ہو تاکہ ہماری برادری میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔

"زندہ باد داڑھی"!

(نیرنگ خیال)

ندامت

مُسلم کلب پونا میں برج کی میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہم لوگ "لائٹ آف ایشیا" کے لمبے کش کھینچ رہے تھے۔ واحدی صاحب بولے کہ "بھئی میرے اوپر آج ایک عجیب واقعہ گذرا"۔ میں نے کہا "خیر تو ہے"؟ بولے کچھ نہیں ہے تو معمولی سا مگر اب تک ندامت کی وجہ سے پسینہ میں تر ہوں۔ کل میرے بھائی کی شادی تھی آپ تو گئے تھے اتارانے رات کو عجیب لہجہ میں وہ دلاری والی چیز تالی بجا بجا کر گائی تھی مجھکو بہت پسند آئی۔ "چھوئے نہ دبیے جو بنیا"۔ ہر ہر منٹ پر میں اس کو دہراتا تھا۔ آج دو بجے تمام رات اور دن کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ ذرا لیٹ رہا آدمی آیا کہ سیٹھ صاحب بلاتے ہیں جا کر دیکھا تو والد صاحب کے پاس آٹھ دس آدمی بیٹھے ہیں۔ مجھ سے بولے کہ "دیکھو احمد بھائی کریم سیٹھ سے ملو۔ آپ کل شادی میں شریک نہ ہو سکے آج کراچی سے آئے ہیں۔ انھیں کی لڑکی سے میری شادی ٹھیری تھی۔ آج پہلی دفعہ میں نے دیکھا۔ دو چار باتیں مجھ سے کر کے وہ پھر والد سے گفتگو کرنے لگے۔ میں اٹھنے لگا۔ والد نے آنکھ کے اشارے سے ٹھہرنے کو کہا۔ میں علیحدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب بڈھے تھے اور خوب باتیں کر رہے تھے کچھ والد کا ادب کچھ

ان کے والد سے جھجک سب کا مُنہ دیکھتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ باتیں ختم ہی نہیں ہوئی تھیں، اسی اثنا میں مجھے "چھوئے نہ دیبے جوبنا" یاد آگیا۔ اس کو دل ہی دل میں کہتا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا اور لطف اٹھاتا تھا ـــــ میرے سامنے کوئی نہ تھا۔ میں تھا اور "چھوئے نہ دیبے جوبنا"۔ یکایک ہاتھ آہستہ آہستہ سے ترقی کر کے اور زیادہ بلند ہوئے "چھوئے نہ دیبے جوبنا"۔ دل ہی دل سے زبان پر بھی آیا۔ اور اب میں نے یکبارگی پورے زور سے تالی بجائی اور "چھوئے نہ دیبے جوبنا، چھوئے نہ دیبے جو۔۔۔۔ب۔۔۔نا" تال اور سم کے ساتھ کہنے لگا ـــــ "بدتمیز" کی آواز تھی یا کوئی توپ کا گولہ تھا۔ تھرا اُٹھا۔ اب آنکھیں کھُلیں تو دیکھا کہ سب میری طرف دیکھ رہے ہیں اور کچھ لوگ مُنہ پر رومال رکھے ہنس بھی رہے ہیں۔ والد غصے سے سرخ ہیں اور نئے سیٹھ صاحب میری طرف حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ پسینہ آگیا۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ مجھے کیا ہو گیا۔ سوائے اس کے کہ بے تحاشا کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ سامنے حقہ ہے۔ ٹھوکر لگی۔ حقہ گرا، چلم ٹوٹی۔ آگ بکھری مگر میں کود پھاند کر یہ جا وہ جا۔ اس وقت سے اب تک اپنے کمرے میں چھپا بیٹھا رہا اب بولو والد سے کیسے آنکھیں چار ہوں گی؟"

سب خوب دل کھول کر ہنسے۔ مگر میں نہ ہنسا۔ سبط نبی نقوی صاحب متواتر پانچ منٹ تک ہنسا کئے۔ سب انکی طرف دیکھنے لگے۔ "ارے بھئی مجھے اپنا واقعہ یاد آگیا۔"

"تم بھی کہہ ڈالو" سب کی فرمائش ہوئی۔

"کہونگا، پہلے ہنس تو لوں" آخر خدا خدا کرکے قہقہہ ختم ہوا تو بولے کہ

"اچھا ہنسا نہیں"

"ایک ماہ قبل جب میں لکھنؤ میں تھا تو آغا میر کی ڈیوڑھی کے قریب وزیر گنج ایک محلہ ہے وہاں رہتا تھا۔ مکان وہاں بمبئی کی طرح نہیں ہیں۔ نہ لوگ ہی یہاں کی طرح ہیں۔ ایک منزل کا مکان، بڑا صحن۔ اندر جا کر ایک گلی میں واقع تھا یہ بھی یاد رکھیئے کہ شمالی ہند میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً عورتوں کا بہت سخت پردہ ہے چھ ماہ کے بعد مجھ کو مکان بدلنا پڑا۔ مالک مکان خود اس میں آ گئے تھے، ابھی گولہ گنج میں لیا۔ حضرت گنج "اودھ موٹر ورکس" روز سائیکل پر آنا اور روز جانا۔ سائیکل بھی سڑک کو پہچان گئی تھی۔ مکان چھوڑنے کے تیسرے ہی روز میں ریس میں بہت سا روپیہ ہار گیا۔ متفکر اور پریشان آ رہا تھا۔ اس لئے دل ہی دل میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ حضرت گنج سے امین آباد۔ اس کے بعد گولہ گنج۔ لب سڑک اپنا مکان۔ مگر ہماری سائیکل چلی جا رہی ہے۔ گھر دور نکل گیا۔ گولہ گنج کا اتار آ گیا۔ وزیر گنج کی سرحد آ گئی۔ مگر ہم چل رہے ہیں یا ہماری سائیکل چلی جا رہی ہے۔ وزیر گنج کا موڑ آیا۔ ہینڈل اسی طرف کو مڑ گیا۔ پہلے مکان کی گلی آ گئی — سائیکل سے اتر لئے، سیدھے ہاتھ میں سائیکل کا ہینڈل لئے ہوئے اور بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہوئے ہیٹ ٹیڑھا کئے ہوئے اور گردن جھکائے ہوئے

ہم بہت اطمینان کے ساتھ مکان کی طرف بڑھے۔ دروازے میں داخل ہوئے اور سائیکل اسی جگہ رکھی جہاں پہلے رکھتے تھے۔ رک کر تالا لگایا اور پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئے۔

سامنے تمام عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی ایں ایں کہہ کے بھاگی۔ کسی نے دوپٹہ میں منہ چھپایا اور کوئی ہے ہے کہہ کے پکارنے لگی۔ مالک مکان مولوی نیاز احمد لوٹا پھینک چوکی پہ سے کمر بند باندھتے ہوئے اس وقت نکلے جب ہم ارے کہہ کر پھر ڈیوڑھی میں واپس آ کر سائیکل کا تالا کھول رہے تھے۔ ہمارا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور خود کو دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں دے رہے تھے۔ اتنی دور ہم اپنا مکان چھوڑ کر اس مکان میں بلا ارادہ داخل ہو گئے اب یہ کون یقین کرے گا ——— بس اب عزت کا خدا ہی حافظ ہے۔

"کیوں بھئی! یہ کیا حرکت تھی؟" نیاز احمد صاحب غصّے سے کانپ رہے تھے "درانہ گھس آئے۔ کمینہ پن ......"

"سنئے تو سہی!" ہم نے عجیب مایوسانہ انداز میں ان سے معافی مانگی۔ اپنی نادانستگی کا اظہار کیا۔ اپنے خالی الذہن ہونے کا یقین دلایا اور کہا کہ ہاتھوں کو عادت تھی ہینڈل کو موڑنے کی اور پیروں کو عادت تھی چلانے کی۔ اس نے اسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں میں چھ ماہ برابر آیا گیا اور رہا کیا۔" وہ آدمی بڑے شریف تھے اور مجھ سے پہلے سے اچھے تعلقات تھے۔ ورنہ ......"

پھر ہنسی شروع ہوئی مگر میں اب بھی نہ ہنسا۔ ایکی سب لوگ میری طرف متوجہ ہوئے۔

"آخر آپ کیوں نہ ہنسے؟"

میں نے کہا" ایسی کوئی بڑی بات نہیں جس پر میں ہنسوں"۔

"اچھا آپ اس سے بڑی کوئی بات کہیں گے۔ کہئے کہئے!" سب کی صدائیں آنے لگیں آخر مجھ کو بھی کہنا پڑا۔

"پچھلے سال میں بمبئی کی سیر کی غرض سے آیا تھا۔ میری واپسی میں چند ہی روز باقی رہ گئے تھے کہ قمر صاحب جو میرے نئے دوست تھے اصرار کرنے لگے کہ چلو آج والکیشر، وہاں بڑی بڑی نایاب تصویروں کا نیلام ہوگا۔ سب جا رہے ہیں۔ ہم بھی دیکھ آئیں۔

وہاں پہونچے تو دیکھا کہ بمبئی کا کوئی کروڑپتی ایسا نہیں ہے جو وہاں نہ ہو۔ کوئی تصویر ایسی نہ تھی جو بیس ہزار سے کم پر چھٹی ہو۔ پہلے تو ہم ادھر ادھر ٹہلا کئے اس کے بعد ہم ہر تصویر کے پاس جا کر اس کو غور سے دیکھتے تھے اور آپس میں، آہستہ آہستہ لہجوں میں سر کو ہلا ہلا کر اس کے متعلق ریمارک پاس کرتے تھے۔ ہم کو دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ ہم بھی کوئی ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر نہایت نفیس تھی۔ ہر شخص اُسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی بہت دیر تک اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کئے اور کر ہی کیا سکتے تھے؛

آخر کار تھوڑی دیر میں نیلام شروع ہوا - ہال نیلام کرنے والوں کی آواز سے گونج اُٹھا - شروع میں تو قیمت طوفان کی طرح بڑھتی تھی - اور بعض آوازوں میں تصادم بھی ہو جاتا تھا - کچھ لوگ اپنی حد میں رہ کر ایک دو بولیاں بول کر خاموش کھڑے ہوئے تماشہ دیکھتے تھے اور کچھ لوگ آخر دم تک پیچھا نہ چھوڑتے تھے -

بعض دو آدمیوں میں ضد بھی ہو جاتی تھی اور ایک دوسرے کی ضد پر بولیاں بولتے تھے - جو صاحب اپنی حد تک پہنچ جاتے تھے وہ یا تو گردن نیچی کئے کھڑے ہو جاتے یا ٹہلتے ہوئے دوسری طرف آجاتے تھے - ہم نے چند تصویروں کے نیلام میں لوگوں کی آواز، انداز اور بولی بولنے والے کے چہرے کا غور سے مُطالعہ کیا جس تصویر کی قیمت زیادہ بڑھنے والی ہوتی تھی اُس پر بولی لگانے والے کڑک کڑک کر بولتے تھے اور نیلام کرنے والا ان کی بولی کو دو مرتبہ سے زیادہ نہ دُہرانے پاتا تھا کہ دوسری آواز آ تی تھی - ہر تصویر کے متعلق اُس کی ممکن پیشین گوئیاں بھی سُنتے جاتے تھے - ان تمام باتوں کو مد نظر رکھ کر ہم نے قمر صاحب سے کہا کہ ہم بھی بولی لگائیں گے -

وہ میرا مُنہ دیکھنے لگے ——— میں نے کہا کہ تھوڑی سی تفریح ہو گی - بولے " اگر بولی تمھیں پر چھوٹی تب ! میں ہنس دیا ——— اب میں ہر تصویر پر بول رہا تھا -

شروع میں میں بولی بولنے والوں سے بڑا گرم مقابلہ کرتا رہا۔ ادھر کسی کے منہ سے رقم کا نام نکلا اور ادھر میں نے فوراً پچاس ساٹھ یا سو ڈیڑھ سو، صورت حال کو دیکھ کر اضافہ کر دیئے۔ ایک تصویر دو سو سے شروع ہوئی ایک سیٹھ اس کے بڑے گرویدہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ دس بڑھا کر کہتے تھے تو میں پچاس بڑھا دیتا تھا۔ بڑا زبردست مقابلہ رہا۔ یہاں تک کہ ساڑھے تین ہزار تک پہونچکر میں خاموش ہو گیا۔ وہ میری طرف گھور کر چلّائے چار ہزار۔ نیلام کرنے والا چار ہزار دُہرا رہا ہے اور مجھ کو دیکھتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مجھ سے کہتے ہیں آپ نے بہت دام کہدیئے۔ میں ہنس کر جواب دیتا ہوں ان داموں تو چیز اچھی تھی، پڑی رہتی۔ خیر دہی سیٹھ لے لیں۔ اب نہ بولوں گا۔

اس طرح سے تمام مجمع میں میں نمایاں ہو گیا۔ اب اس تصویر کا نمبر آیا جو سب تصویروں کی جان تھی۔ ایک آگ سی لگ گئی۔ جو ہے وہ اُسی کی طرف ٹوٹا پڑتا ہے۔ پانچ ہزار پہلی بولی تھی۔ ابھی پورے پانچ کہنے بھی نہ پلئے تھے کہ ساڑھے پانچہزار کی دوسری طرف سے آواز آئی۔ ابھی وہ آواز ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ چھ ہزار ہو گئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ بیس ہزار تک جائیگی۔ اس لئے میں نے نڈر ہو کر آنکھیں بند کر کے بولنا شروع کیا۔ شروع میں تو میری آواز اس قدر حاوی نہ تھی اس لئے کہ ہر طرف سے بولیوں کا غلغلہ تھا۔ آخر میں صرف دو آدمی باقی

رہ گئے اور تیسرا میں تھا۔ باقی سب خاموش تھے۔

میں جب اُنیس ہزار پر پہونچا تو میرا حریف صرف ایک پارسی باقی رہ گیا مجمع کی نظریں اپنی طرف مُڑی ہوئی دیکھ کر مُجھ کو کچھ جھجک سی محسوس ہوئی اور اپنی پوزیشن کا احساس کرکے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ پارسی نے بیس ہزار کہے۔ نیلام کرنے والے نے دُہرائے۔ مجھ کو دیکھا۔ پھر دہرایا بولا نایاب چیز ہے اور بڑھایئے اور......

"بائیس ہزار"

یہ الفاظ بیساختہ میرے مُنہ سے نکل گئے۔ میرا ہرگز ارادہ نہ تھا لیکن اس نیلام کی آواز نے مجھ پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ یہ الفاظ ادا ہو ہی گئے اب میں تھرتھرا رہا تھا۔ قلب کی حرکت کی آواز کانوں تک آرہی تھی۔ اور ہاتھ پیروں میں سنسنی پیدا ہو چلی تھی ——— پلٹ کر دیکھا تو قمر صاحب غایب تھے۔ اب صرف ایک امید تھی۔ میں نے پارسی کے چہرے پر نظر کی، مگر وہاں اُس کے بولنے کا امکان ہی تھا ——— کیا کروں گا؟ یہ سوال اپنے دل میں دُہرا رہا تھا۔ میری جیب میں اس وقت ڈیڑھ سو کے نوٹ تھے اور گھر پر ڈاکخانہ کی کتاب میں پانچسو۔ یہ کل اثاثہ تھا۔ کوئی ایسا عزیز بھی نہ تھا جس کے پاس اتنی بھاری رقم ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو ایک تصویر خریدنے کیلئے وہ مجھے کیوں دیتا۔ ہائے کیا کروں۔ میں اپنی انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

بائیس ہزار، بائیس ہزار ایک دو۔ ایک دو، بائیس ہزار ایک دو
میں سہارا لینے کے لئے ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں
سے رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اُدھر پارسی رخ پھیر کر وہاں سے جا رہا تھا
اور اُدھر میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین کی آواز ایک بجلی تھی جو میرے
خرمن ہوش و حواس پر گری لیکن میں نے بلا کا ضبط کیا اور دل کو سنبھالنے
کے لیے قریب رکھی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی پارسی میرے
پاس آیا اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگا "دو سو روپیہ نفع لے کر تصویر
چھوڑ دینے پر تیار رہو۔"

میں یہ سن کر دوبارہ زندہ گیا۔ لیکن اتنے قلیل نفع پر میرا دل آمادہ نہ
ہوا۔ میں نے پانسو طلب کئے اور پانسو مجھ کو مل بھی گئے۔

(نیرنگ خیال)

تکلّف

"اے ذوقِ تکلّف میں ہے تکلیف سراسر" یہ تو زباں زدِ عام مصرع ہے لیکن اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سچ بولنے کی کوشش کرنا۔ بفرضِ محال اگر کوئی شخص کامیاب بھی ہو جائے تو وہ سوسائٹی کے لئے ایک مسلسل خطرہ بن جاتا ہے کیونکہ بے تکلفی موجبِ تکلیف ہے اور صداقت دلآزار۔ یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ محال کی قید دہقانیوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ متمدن اور مہذب انسانوں کے لئے ہے جن کے اخلاق کی عمارت "دروغ مصلحت آمیز" کے سنگ بنیاد ہی پر قائم ہے۔

خصوصیت کے ساتھ دسترخوان ایک ایسا میدان ہے جہاں تکلف اور اصرار کی رسہ کشی کی جاتی ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بازی میں میزبان جیتتا ہے یا مہمان۔ بہرحال اول الذکر کی دیگ اور آخر الذکر کا شکم اپنی اپنی قابلیت کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔ اندریں حالات اگر مقابلہ برابر کا ہو تو لطف آتا ہے لیکن کمی اور زیادتی میں تکلیف ہوتی ہے۔ جس طرح کھڑی ہوئی پتنگ بیچارگی ڈھیل چھوڑنے سے ڈھے جاتی ہے۔ اسی طرح میزبان کی یکایک ڈھیل مہمان کے توازن کو اس طرح متزلزل کر دیتی ہے۔ کہ وہ خود اپنی ہی جھونک میں

آگر گر پڑتا ہے۔ دسترخوان سے بہت دور۔ جہاں صرف چمچوں اور پلیٹوں کی جھنکار کی صدا ہی پہونچ سکتی ہے اور طعام گوناگوں کی خوشبو، لیکن دست درازی ناممکن۔ ایسی حالت میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل، اسی خاص وقت کے لئے کہا گیا ہے۔

ایسے موقع کی نزاکت کا احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس پر کبھی ایسا معرکتہ الآرا، واقعہ گزرا ہو۔ ممکن ہے کہ آپ ہم سے زیادہ قابل ہمدردی ہوں۔ لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ ذیل کے حادثہ کی روئداد سن کر بھی آپ اسی خیال پر قائم رہینگے یا نہیں؟

ہماری سسرال لکھنؤ سے دور اور پنجاب سے قریب واقع ہوئی تھی جہاں ہم تازہ وارد تھے اور وہاں کی خصوصیات سے ناآشنا۔ سفر کی تکان اور ناشتہ کی کمی سے ہم گرسنہ ضرور تھے لیکن مطمئن کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ سرشام ہی سے ہماری شب کی دعوت کے انتظامات اعلیٰ پیمانہ پر کئے جا رہے تھے۔

آخر کار انتظار کی کشمکش سے ہم کو نجات ملی۔ ہندوستانی دسترخوان پر انواع واقسام کی لذیذ ولطیف اغذیہ چنی گئیں۔ جن کی تخیلی صورت ہی نے ہمارے قوائے انہضام میں تحریک پیدا کر دی تھی اور اس حقیقت نے ہمارے ذہن خشک میں آبیاری کی ——— فیملی کے ایک ممتاز رکن نے اس امر کی تحریک کی اور دوسرے اشخاص نے اس کی تائید۔ مگر ہم نے اس مجوزہ صدر کی طرح جو

کرسئ صدارت کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا بھی رہے اور اس کے قبول کرنے سے رسماً انکار بھی کرتا رہے ــــ دست بستہ عرض کردیا کہ کیا کروں طبیعت میں گرانی ہے، بھوک ہی نہیں ہے۔

ہمارے اس عذر کی ہم کو یقین تھا کہ کوئی سماعت نہیں کی جائیگی۔ لیکن انھوں نے ہمارے بیان کو عدالتی گواہوں کے حلفیہ بیان کی طرح صحیح مانتے ہوئے ضمناً ارشاد فرمایا کہ

"تکلف تو نہیں کررہے ہو ؟"

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ ہم اس جملے کا جواب سوائے اس کے کہ "نہیں کررہے ہیں" اور کیا دیتے ۔ اسی دوران میں ایک طرف سے ہم کو مزید اصرار کی توقع تھی اور یقیناً بازی اپنے ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ہم ان کے ایک خفیف سے اشارہ پر بھی لبیک کہنے کو تیار ہوجاتے لیکن اسی وقت ایک دوسرے صاحب جو ابد کو معلوم ہوا کہ ہماری شادی سے قبل خانم کے ناکام امیدوار رکھے محض ہم کو بھوکا رکھنے کے لئے "شہر میں کالرا پھیلا ہوا ہے" کی بے بنیاد روایت بیان کرکے خود گول ہوگئے ۔ دوسرے خاموش اور ہم خجل ۔ یقین مانیئے اس خبر وحشت اثر سے کہ ہم تمام رات بھوکے رہیں گے ہمارے معدہ میں ایک انتشار عظیم برپا ہوگیا۔

میرے خیال میں گرمی عشق اور شدت گرسنگی اثرات کے لحاظ سے

ایک ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ " وہ اضطراب کا رونا ہوا سکوں میرا " میرا اس وقت صحیح مرقع تھا۔ آہ! " ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی " تقدیر نام ہے انھیں واقعات کا۔ میں دسترخوان کے قریب بیٹھا ہوا پلیٹوں اور پیالوں کو ندریجاً خالی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ نہ کرسکتا تھا ——— کاش اس وقت زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس ہوتا تاکہ کچھ نہ کچھ میری طرف بھی ڈھلک آتا۔

آخر میں نا انصافی کسی طرح نہ برداشت کرسکا۔ اور ایک غیور میونسپل کمشنر کی طرح وہاں سے " واک آؤٹ " ہوکر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔

وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرش خواب میرا

میرے لیٹنے کے بعد میرے پلنگ کی کیفیت کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ میں اپنی چھوٹی آنتوں کو تلقین صبر کرتا تھا لیکن میرے پیٹ کو کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ گویا یہ بھی کسی ہجراں نصیب کا دل تھا۔ مجھ ایسے تعلیم زدہ نوجوان پر جس نے آج تک روزہ رکھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا ماہ رمضان کی صداقت کا اسی ہنگامہ خیز شب کو یقین ہوا تھا۔

دو بجے رات کے ہماری عنان صبر ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ہم نے ارادہ کیا کہ جائز یا ناجائز جس طریقہ سے بھی ممکن ہو ہم اپنی تواضع خود کرینگے۔ اس موقع پر تنگی دامن کے سامنے دست سوال دراز کرنا گویا عمر بھر کے لئے خود کو

زعفران کا کھیت بنا دیا تھا۔ رہ گیا بازار جانے کا مسئلہ سو وہ بھی بے سود تھا۔ کیونکہ ہوٹل کھانا کھانے کی جگہ ہے نماز پڑھنے کی نہیں کہ ہر وقت کھلا رہے۔ اب ہمارے سامنے ایک ہی صورت تھی "کریمن کی" جو بیک وقت ہماری خانم کی راز دار سہیلی، ان کی والدہ کی منہ بولی، گھر کی منیجر، باورچی خانہ کی چوکیدار اور ہماری بے تکلف دوست تھی۔

ہم ایک ناتجربہ کار چور کی طرح لرزاں و ترساں اُٹھے اور بمشکل تمام باورچی خانہ پہنچے۔ رستے کی صعوبتوں کا حال بیان کرنا گویا سندباد جہازی کے دریائی سفر کی روداد بیان کرنے کے مترادف ہوگا اس لئے قطع کیا جاتا ہے وہاں ہم نے کریمن کے پلنگ کے پاس پہنچکر اُس کے منہ پر جیبی لالٹین کا فوکس ڈالا اور اس کی اُنگلی پکڑ کر جگانا شروع کیا۔ اس نے پہلے ایک طرف کی کروٹ لی اور اس کے بعد دوسری طرف کی۔ آخر ہم نے جی کڑا کر کے اس کو ہلکے سروں میں پکارا لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بمجبوری ہم نے اُس کی اُنگلی کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے تحاشہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور "کون ۔۔۔ ؟" کی ایک ڈراونی چیخ لگانے والی ہی تھی کہ ہم نے لپک کر اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کو مطمئن کرنے کے لئے ٹارچ کا جھپکا اپنے مُنہ پر چھوڑ کر خود کو ظاہر کر دیا۔

ہو گئی اور مجھ کو ایک ہلکا سا دھکا دیکر غصّہ میں کہنے لگی۔

"تم کیوں آئے اس وقت ؟"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے کریمن !" میں نے گڑگڑا کر کہا۔

"بہانے تراشتے ہو .... صبح ہونے دو حشر مچا دونگی۔" اُس نے گرجتے ہوئے کہا۔

اس خلاف امید تمہید سے ہمارے ہوش وحواس رخصت ہو گئے اور ہماری نظروں میں زمین اور آسمان گھومتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ دل کی حالت تھی کہ موٹر کے ٹیوب کی طرح پھٹ جائیگا اور دماغ کی یہ کیفیت کہ کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل جائیگا۔

"خدا کے لئے معاف کردو۔ میں جاتا ہوں۔" میں نے دست بستہ عرض کیا۔

"میں بیوی کو دیتی ہوں آواز۔" اُس نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

بس اُس وقت مجھے اپنی بیکسی اور غربت پر رونا آگیا۔ آنسوؤں کے سیلاب اور ہچکیوں کے جھٹکوں کا اس پر اتنا اثر تو ہوا کہ وہ کچھ موم ہو گئی اور شکایتاً کہنے لگی کہ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔"

میں پلٹ کر جانے والا ہی تھا کہ دفعتہً میرے پیچھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ "ہائے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" یہ کہہ کر کریمن تو زمین پر بیٹھ گئی،

مگر آنے والے شخص نے برقی بٹن پر ہاتھ رکھ کر بلب کو روشن کر دیا۔
میں اپنی بیوی کو جس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔
"کیوں جی تمھارے یہ گن ہیں"۔ ان کا چلا کر کہنا تھا کہ سارا مکان کھل بلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چشم زدن میں میرے چاروں طرف سالے، سالیوں، ساسوں بھاوجوں کا گروہ کا گروہ کھڑا ہوا تھا ــــــ اور میں سہارا لینے کے لئے ستون سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

(ساقی)

گالیات

علم و ادب کے میدان میں شعر پر لاتعداد مقالے تصنیف کیے جا چکے ہیں لیکن تعجّب ہے کہ گالی پر آج تک ایک بھی پمفلٹ شایع نہ ہوا حالانکہ ہماری روزمرّہ کی زندگی کے لیے جس طرح شعر کا احساس ضروری ہے اسی طرح گالی کا احساس بھی۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ گالی جب انتہائی درجہ ارتقاء پر پہونچ جاتی ہے تو شعر کہلانے لگتی ہے۔ اس لیے علم شعر کے متعلق ہماری تمام معلومات اُس وقت تک تشنہ رہینگی جب تک گالی کو جو شعر کی ابتدائی صورت ہے ہم ادب، فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں جانچ نہ لیں۔

گالی کی تعریف۔ گالیوں کا منبع جذبات کی فراوانی ہے۔ اس لیے شعر کی طرح یہ بھی وجدانی شے ہوئی جس طرح انجن میں بھری ہوئی بھاپ کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے کچھ بخارات خارج کیے جاتے ہیں اسی طرح دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے اور طبیعت کو راہ پر لانے کے لئے شعر کہے جاتے ہیں اور گالیاں دی جاتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گالی اور شعر میں فرق کیا ہے؟ اس کا مختصر ترین جواب "سماج کی ذہنیت" میں مضمر ہے۔ وجدانیات کے تحت

ہر وہ عبارت کہ جو علانیہ پڑھی جاسکے شعر ہے اور جس عبارت کا علانیہ پڑھنا، بولنا اور سننا ممنوع ہو وہ گالی ہے۔ اس نقطہ نظر سے خلوت میں شعر اور گالی کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ یہ تعریف ہندوستان کی تمام اقوام، فرقوں، اور طبقوں کو محیط کر لیتی ہے جن میں جاہل اور عالم کی کوئی تخصیص نہیں۔ البتہ افراط و تفریط کا سوال ہے۔

گالیوں کی تقسیم (باعتبار معنی) (۱) "اسمی" وہ گالیاں کہ جن میں محض نام لے دیا جاتا ہے۔ اس صنف میں چند نام ہیں۔ کہ جو سوسائٹی میں شجر ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ممانعت اس خیالی دنیا میں لذت پیدا کرنے کیلئے کافی ہے۔ اگر زبان کے اس سنسر کو اٹھا لیا جائے تو گاندھی کے نمک کی طرح ان میں بھی کوئی چاشنی نہ رہیگی۔ اور مخصوص طریقہ سے نیچے "گالی کی تکرار پر مُصِر ہونگے۔
(۲) "خبری"۔ وہ گالیاں کہ جن میں محض اظہار واقعہ کر دیا جاتا ہے جس کا تعلق مخاطب کی ذات سے ہو سکتا ہے یا اُس کے خاندان سے۔ تاثرات کے لحاظ سے پہلی صورت میں وجدانی کیفیات کا مُظاہرہ اس قدر بیساختہ نہیں ہوتا جس قدر کہ آخری صورت میں، اندریں حالات داد دینے میں مخاطب کی زبان ہی حصہ نہیں لیتی بلکہ تمام جسم کا اشتراک عمل ہوتا ہے جس کے اثرات اکثر صورتوں میں دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ طرفین میں "ذوق ثقیل" کی کمی نہ ہو۔
ایسی تمام گالیاں کم و بیش جنسیات کے تحت میں آتی ہیں جو ایک

کتاب ہے غلط فہمیوں کے مسلسل ابواب کی جنسی گالیوں کے ماتحت جو نقص ان کی وارداتیں رونما ہوتی ہیں ان کا ایک حد تک یہی سبب ہے کہ مہذب دنیا کا انسان حقیقت کو دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عربی میں الحق مُرٌّ کہا گیا ہے۔

(۳) "تخیلی" وہ گالیاں کہ جن میں دیرینہ آرزوؤں کا تخیل شامل ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ایک گالی ور (گالی دینے والا) اپنے مخاطب کے عزیزوں سے اپنے ذہن لاشعوری میں ایک رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ اس کی تکمیل کا امکان نہیں ہوتا اس لئے حسرتوں اور ارمانوں کی زبانی تکمیل ہی سے دل کو خوش کر لیتا ہے۔

(۴) "وصفی"، وہ گالیاں کہ جن میں کوئی نمایاں صفت بیان کر دی جاتی ہے یہی وہ صنف ہے جہاں سے گالی اور شعر کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں اور شاعر اور گالی ور کی ہستی ایک دوسرے سے موصل، زبان کی وسعت، خیالات کی نزاکت، تشبیہوں اور استعاروں کی خوبیاں پیش شروع ہوتی ہیں۔ گالی وسیع ہو کر پھبتی۔ ضلع جگت اور ہزل و ہجو کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔ طنزیات ایک مستقل فن ہے۔ جس کی پرواز شعر کی نازک خیالی سے بھی پرے ہے۔ اس کی اصل گالی ہی ہے۔ جس کو کراہیت کے بجائے نفاست، ثقالت کے بجائے نزاکت اور بیساختگی کے بجائے تکلف اور تصنع

سے آراستہ کرکے ارتقا کی منزل آخر تک پہونچا دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کونین کی کڑوی گولی پر شکر کا قوام۔ لیکن طبعی خواص دونوں کے تبدیل نہیں کیئے جاسکتے۔

گالیوں کے محرکات، (۱) جذبۂ غضب، تمام وہ اشیاء جو انسان کی جسمانی اور روحانی اذیت کا موجب ہوتی ہیں اور اس کی خواہشات کی تکمیل میں سدّراہ۔ وہ اس جذبہ کو بھڑکاتی ہیں۔ خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح۔ ایسی حالت میں انسان اپنی امکانی طاقت صرف کردیتا ہے کہ ان اشیاء کو فنا اور برباد کردے۔ یہاں تک کہ جب وہ عاجز آجاتا ہے تو اس کو خود اپنی ذات پر بھی غصہ آتا ہے۔ اور اس آخری کوشش میں وہ اپنے جسم اور روح دونوں کو قربان کردیتا ہے۔

کائنات کو محفوظ رکھنے کے لیئے قدرت کا یہ اصول کہ انسان خدا نہیں بن سکتا اور خدا انسان نہیں بن سکتا۔ حکمت پر مبنی ہے۔ ورنہ دونوں صورتوں میں ہمارے لیئے ہر روز روزِ حشر اور ہر شب قیامت کی رات ہی ہوتی۔ بہر حال قدرت نے ایک دوسری پیش بندی بھی کی ہے اور وہ یہ کہ انسانی فطرت کے اس تخریبی عنصر کو کم کرنے کے لیئے اس نے انسان کو گالیاں سکھادیں تاکہ زبردستوں اور زیردستوں میں تصفیہ کی صورت زبانی ہی رہے۔ لیکن ان پیش بندیوں کے باوجود کمزوروں کی زبان درازی کبھی کبھی شہ زوروں کی دست درازی میں تحریک

پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر تہذیب یہ چاہتی ہے کہ ضعیفوں کے پاس گالیوں کا آخری حربہ بھی باقی نہ رہے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ غریبوں کا اللہ والی۔

اس دقت کو رفع کرنے میں قرآن شریف نے متمدن انسان کو گالی کا ایک بہترین عوض عنایت فرمایا تھا اور وہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" تھا۔ لیکن ہم ہندی مسلمانوں کا خدا بھلا کرے کہ ہم نے اس کو اپنے محاورہ میں "لاحول بھیجنا" اور "لاحول پڑھو" بنا لیا ہے۔ جس سے عام مفہوم گالی ہی کا لیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو ایک غیرت دار مسلمان پر تجربہ کر کے دیکھ لو

(۲) جذبۂ محبت۔ گالیاں عداوت میں ذرچسپی پیدا کر دیتی ہیں اور محبت میں چاشنی، صورت اول میں ان کو گالیاں کہتے ہیں اور صورت آخر میں "سہالیاں" کہتے ہیں۔ ماؤں کی گودیں بچوں کے لئے گالیوں کا بہترین کول ہیں اور شاعروں کی غزلیں گالیوں کا جامع نصاب۔ اگر اپنے دوستوں کو وفادار اور اپنی اولاد کو فرمانبردار بنانا چاہتے ہو تو ان کی مدارات گالیوں سے کرو لیکن دفتر میں نام پیدا کرنے اور صاحب کے دل میں جگہ پیدا کرنے کے لئے یہ دستور العمل مفید نہیں۔ ایک تجربہ کار اور ممتاز ہیڈ کلرک نے اپنے دفتر کے ایک نوآموز کلرک کو ایک دن حسب ذیل مشورہ دیا۔ نوجوان کلرک نے کاغذات کا فائل ہیڈ کلرک کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں آج صاحب کے پاس دستخط کرانے نہیں جاؤنگا۔"

"کیوں؟"

"صاحب کچھ موڈ میں نہیں ہیں، ڈیم فول کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا ہے"۔

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم جلد مستقل ہونا چاہتے ہو؟"

نوجوان نے سر ہلا دیا۔

"تو ایسے موقعوں پر جبکہ صاحب موڈ میں نہ ہوں بلا ضرورت بھی چلے جاؤ احتیاطاً کانوں میں روئی ٹھونس لیا کرو"۔

نوجوان خاموش رہا۔

"کیا تم میری کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہو کیونکہ میری پنشن کے دن قریب ہیں"؟

نوجوان مسکرا دیا۔

"تو منتظر رہو کہ صاحب تمھارے لات ماریں"۔

نوجوان کے چہرے پر شکن آگئی۔

"تو استعفیٰ تیار رکھو تاکہ وقت ضرورت کام آئے"۔

(۳) اظہار طاقت۔ ایک فرد کو اپنے دوسرے ہم جنسوں پر فوقیت جتلانے کے لئے چند لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً علم، دولت، لباس، حسن وغیرہ لیکن جن لوگوں کے پاس اظہار طاقت کے تمام ذریعے مفقود ہوتے ہیں اُن کا منہ موتیوں کے بجائے گالیوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ صاحب اور پولیس اس کلیّہ سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴) ہمدردی و نقل ۔ فیشن ایبل چیزوں کی طرح گالیاں بھی وبائی ہیں دونوں میں ایجاد و اختراع بھی ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ایک کے موجد اپنا اشتہار دیتے ہیں اور دوسری کے موجد گمنام ہی رہنا چاہتے ہیں ۔ ان لوگوں کی اہمیت بھی مسلم ہے ۔ کہ جو ان تمام اختراعات کو قدیم خرافیات کی طرح محفوظ رکھتے ہیں اور اپنی سوسائٹی میں سینہ بسینہ منتقل کرتے رہتے ہیں ۔ ایسی اقوام جو گالیوں کو محض تکیہ کلام اور فیشن کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں ان میں زیادہ تر ہندی انگریز ہیں

گالیوں کی زبان ۔ ہندوستان میں تہذیب خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ہمیشہ سے بدیشی اشیاء کی سرپرستی کرتی رہی ہے جن میں حکومت اور زبان مخصوص طریقہ سے بیرونی ہی رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دیسی گالیاں حقیر خیال کی جاتی ہیں اور بدیشی گالیاں معزز ۔ یعنی گالیاں بالذات ممنوع نہیں ہیں بلکہ بالزبان ممنوع ہیں ۔ وہ تمام الفاظ جو دیسی زبانوں میں گالیوں کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں اہل لغت اور مہذب جماعت سے خارج کر دیئے گئے ہیں لیکن اگر وہی مفہوم بدیسی زبانوں میں ادا کر دیا جائے تو دونوں میں شامل کر لئے جاتے ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے جہلا کی تمام گالیاں بازاری ہیں اور ان کے جہلا کی گالیاں ٹکسالی ۔ گویا ہم کو اپنی زبان میں غصہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ۔

گالیوں کی تقسیم (بلحاظ زبان) (۱) موٹی گالیاں جن سے احساسات

کو ٹھیس لگتی ہے اور تنفر اور کراہیت کے تمام آثار جسم اور چہرے پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ سوائے ہندوستان کی دیسی زبان ٹھیٹھ ہندی کے۔ ان کی سرپرستی ہمارے جہلاء کا طبقہ کیا کرتا ہے ورنہ یہ کب کی مفقود ہوگئی ہوتیں۔

رسمی گالیاں، اسی قبیل کی گالیاں ہیں۔ کہ جو روائتی طور سے ہمیں قدیم ہندوستان سے موصول ہوئی ہیں۔ اور ہماری مہذب سوسائٹی میں جگہ پاگئی ہیں۔ یہ گالیاں ہم لوگوں کی زبان سے بیساختہ نکل جاتی ہیں۔ لیکن ہوا کی لہروں میں اس قدر جلد کھو جاتی ہیں کہ سامعین کے کانوں تک بھی نہیں پہونچ سکتیں۔ یا اگر پہونچتی بھی ہیں تو ہمارا تلفظ اور لہجہ ان کے روپ کو بدل دیتا ہے۔ ہندوستان میں موٹی گالیاں رامپور کی اور بمبئی میں بھنڈی بازار کی مشہور ہیں۔ "رسمی گالیاں" علی گڈھ، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد کی ٹکسالی خیال کیجاتی ہیں۔

(۲) گوری گالیاں۔ دوستوں کو چھیڑنے، مذاق بنانے، بچوں کو ستانے اور تزئین کلام کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ اس صنف میں کسی خاص زبان کی تخصیص نہیں ہے البتہ فی زمانہ انگریزی ان کی جگہ سُرعت سے لے رہی ہے۔

(۳) شرعی اور علمی گالیاں، ان کے لئے بلا استثناء عربی، فارسی اور سنسکرت زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ تمام ہندوستانی واعظوں خطیبوں اور

پنڈتوں کو انھیں زبانوں میں جلال اور غصہ آتا ہے۔

گالی اور پلیتھنے۔ عام طور پر لوفر اور شریف کے درمیان امتیازی نشان گالیوں کا خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں نے آج تک اس شریف آدمی کی صورت نہیں دیکھی کہ جو اندھیرے میں کسی میز یا پلنگ سے ٹھوکر کھا کر گرا ہو اور اس نے اس چیز کی شان میں ایک تازہ بتازہ فصیح و بلیغ قصیدہ نہ پڑھا ہو۔ نہ صرف یہی بلکہ میں ایسے آدمیوں کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے اس بےگناہ شئے کی لات نوازی بھی کی ہے اور صبح اٹھ کر خود ہسپتال گئے ہیں اور مجروح شئے کو بڑھئی کے کارخانہ میں مرمت کے لئے بھجوایا ہے۔ اسی طرح اگر یہی تکلیف آپ کو کسی انسان کے ہاتھوں پہونچی ہو۔ جسمانی یا روحانی تو میں یقین نہیں کر سکتا کہ آپ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں فرمائینگے کہ دیکھئے خبردار رہیئے ورنہ آپ کی مادر محترمہ کی شان میں میرے دہن سے چند گستاخانہ الفاظ صادر ہو جائینگے یا اگر خدانخواستہ آپ کو کوئی شخص معذور اور مجبور سمجھ کر آپ کے جسم اطہر سے بےادبی کرے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ آپ اس وقت اقبال کا شکوہ سوز و ساز کے ساتھ پڑھینگے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ گالی عین اقتضاء فطرت انسانی ہے۔ البتہ بعض لوگ ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور بعض لوگ عادتاً۔ دراصل آخرالذکر طبقہ ہی پر ہماری اصطلاح گالی ور صادق آتی ہے اور جہاں کہیں ہم نے اس لفظ کو استعمال

کیا ہے۔ وہاں کم وبیش اسی معنی کے ماتحت کیا ہے۔

لوگوں کا عام خیال کہ گالی وردراصل طبقہ جہلا میں پیدا ہوتے ہیں غلط ہے، اس کا تعلق فی الحقیقت انسان کی فطرت، قومیت، پیشے اور ماحول سے ہے اس سے انکار نہیں کہ تعلیم بھی ایک قسم کا ماحول ہے۔ لیکن مسلّم ماحول نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک حصّہ ہے۔ اس لئے وہ فطرت انسانی کو یکسر تبدیل نہیں کر سکتی وگرنہ چند نسلوں کی تعلیم کے بعد بچے خود بخود تعلیم یافتہ، مہذب اور متمدن پیدا ہونے لگتے۔ اور ان کو ابتدائے عمر سے سکولوں اور کالجوں میں بھیجنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم ہندوستان کی دو تعلیم یافتہ اقوام پارسی اور ہندی انگریزوں کو پیش کرینگے اور ان کے نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد تحقیق کرینگے کہ ان کی قومیت پر گالیوں کا اتنا گہرا رنگ کیوں چڑھا ہوا ہے؟

پارسی۔ ان کی گالیاں تجارتی ہوتی ہیں۔ جن کی مدد سے ان کی گفتگو دلچسپ اور ان کا بیان پرزور ہو جاتا ہے۔ من حیث القوم پارسی جسمانی لحاظ سے نازک واقع ہوئے ہیں، اس لئے ذرا زبان دراز ہیں۔ ضعیف عورتوں کی سرونتوں کی طرح ان کی زبان چلتی ہی رہتی ہے لیکن ان کی گفتگو کا عنوان علمی اور فلسفی نہیں ہوتا۔ بلکہ نوجوان لڑکیوں کی گفتگو کی طرح ذاتیات سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ بے انتہا تجارتی اور عملی انسان واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے ان کا اخلاق بھی ایک قسم کا تجارتی سرمایہ ہے۔ اور ان کی گالیاں سنہری کنجیاں ہیں

جن سے اجنبیوں کے دل کا قفل بہت جلد کھل جاتا ہے۔ مغائرت کی اوٹ ہٹ جاتی ہے اور چشم زدن میں بے تکلفی ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی غیر تھے ہی نہیں۔ مقاصد کی تکمیل کے بعد ان کی دوستی متاع کی طرح وقت معینہ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ہندی انگریزی۔ دراصل ایک معمہ ہیں۔ ہندوستانی ان کو انگریز خیال کرتے ہیں اور انگریز ان کو ہندوستانی۔ ان کی گالیاں سو فیصدی انگریزی ہوتی ہیں لیکن ان کو استعمال کرنے کے تمام موقعے ہندوستانی۔ چونکہ ان کا وجود دونوں اقوام کی متحدہ لغزشوں کا نتیجہ ہے اس لئے ترکہ اور ورثہ میں اس کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔

مارواڑی۔ اسی سلسلہ میں تمام سود خوار اقوام بھی شامل ہیں۔ ان کا شمار ایک طریقہ سے گالی وروں میں نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ صرف سنتے ہیں دیتے نہیں۔

مزدور۔ بعض انسانوں میں فطرتاً مارنا اور مار کھانا دونوں قسم کی جبلتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ مزدوروں میں یہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسی لئے وہ کمزوروں کو مارنے کی خاطر گالی دیتے ہیں اور زبردستوں کو مار کھانے کی خاطر گالی دیتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داری کے شکنجہ میں پھنس کر ان کا بیشتر حصہ ان جبلتوں سے محروم کر دیا گیا ہے اور ان کے بجائے ان کو قدرت سے

گالیاں دینا اور گالیاں سننا بخش دیا گیا ہے۔

جس طرح کثرت استعمال کے بعد افیمچیوں کیلئے افیون بھی غذا بن جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے لئے گالیاں جزوِ کلام بن گئی ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد یہ لوگ واقعی بیگناہ اور بےضرر ہوگئے ہیں۔ کیونکہ ان کی نیت در اصل کسی کے احساسات کو صدمہ پہنچانے کی نہیں رہی بلکہ یہ لوگ دوست دشمن، عزیز اور غیر سب سے ایک ہی طرح ہمکلام ہوتے ہیں۔ مزدوروں کے کار فرما اور ہندوستان کی پولیس ان کے احساسات کی موت کے راز سے خوب واقف ہوگئی ہے اور اسی لئے ان کی لیاقت کے مطابق بات کرتے ہیں۔ اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ ان کی متذکرہ بالا جبلتوں کے ارتقار کی وجہ صرف یہی ہے کہ ع

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق،

اس لئے دن بھر کی شدید محنت کے بعد بیچارے گالیوں کا مشاعرہ منعقد کرکے دل بہلا لیتے ہیں۔

جناوربان ۔ اس طبقہ میں تمام وہ لوگ شامل ہیں۔ کہ جو اپنے دن کا بیشتر حصّہ جانوروں کی صحبت میں گزارتے ہیں۔ مثلاً کسان جو بیلوں سے ہل چلاتا ہے۔ کھٹارے والا اونچی نیچی پگڈنڈی پر مردہ بیلوں کی مدد سے رینگتا ہے۔ یکہ۔ تانگہ اور گاڑیبان۔ میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ پلیس اور

سواریوں کے بوجھ سے لدا ہوا زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ جانور اور انسان کی اس مسلسل کشمکش میں دونوں اپنی اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ایک اڑ جاتا ہے اور دوسرا بے صبر ہو کر گالیوں پر اتر آتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں۔ کبھی کبھی لات اور چابک کا طرفین میں تبادلہ ہو جاتا ہے۔

سب سے زیادہ معصوم گالیاں اسی طبقہ کی ہیں اور مخصوص طریقہ سے کاشتکار کی۔ کہ جس کے دکھ درد کا کوئی شریک نہیں سوائے دو بیلوں کے۔ اس کی گالیوں میں درد ہوتا ہے۔ التجا ہوتی ہے اور شکوہ ہوتا ہے مگر ظلم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ خود مظلوم ہے کیا اس کی پیٹھ پر فوجدار، زمیندار، اور تحصیلدار کے تازیانے نہیں پڑتے؟ یہی وجہ ہے کہ بیل اس کو لات نہیں مارتے۔

گالیات کا فن ۔ میں اس پر بالتفصیل رائے زنی نہیں کر سکتا لیکن اشارۃً حضرت غالبؒ کا مشورہ درج کئے دیتا ہوں۔ جس کو پڑھ کر آپ خود اپنی رائے قائم کر لینگے۔

غالب مرحوم کی حیات میں ایک کتاب کی تحریر پر ہندوستان کا "سوفیانہ فرقہ" آپ سے اس حد تک ناراض ہو گیا تھا کہ خطوط میں ہندوستان کے اطراف وجوانب سے گالیوں کے پارسل روزانہ بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک میں کسی نے آپ کو ماں کی گالی بھی دی تھی۔ اسوقت آپ نے

حالی مرحوم سے فرمایا تھا کہ افسوس ہے اس شخص کو گالی دینا بھی نہیں آتی۔ مجھ ضعیف اور عمر رسیدہ کو ماں کی گالی دینا حماقت ہے۔ دراصل

بچے کو ماں کی گالی

جوان کو بیوی کی گالی

اور بوڑھے کو بیٹی کی گالی دی جاتی ہے۔

(ساقی ظریف نمبر)

نوک جھونک

افراد

پروفیسر محمود ۔ زندگی کی ستم ظریفیوں کے شکار ۔ زمین کی پچاس گردشیں دیکھے ہوئے ۔

بیگم روشن آرا ۔ چہرے پر حسنِ ماضی کے شکستہ آثار ۔ پروفیسر سے پانچ برس چھوٹی ۔ رشتہ کے لحاظ سے چچا زاد بہن اور قانون کے لحاظ سے منکوحہ بیوی ۔

منصور ۔ ... ... سات سال کا معصوم بچّہ ۔

دردانہ
ریحانہ } ...... بہنیں ۔ آپس میں حقیقی اور پروفیسر اور بیگم کی چچا زاد ۔

سین پہلا

تعارف ۔ [ایک آراستہ کمرے میں جسے ہندوستانی اور انگریزی تہذیب کا مکسچر کہنا چاہیئے پروفیسر کھڑے ہوئے داڑھی مونڈ رہے ہیں ۔ منصور کو بیگم چائے پلا رہی ہیں ۔ دُردانہ و ریحانہ میز کے قریب بیٹھی ہوئی عصمت کا سالنامہ پڑھ رہی ہیں]۔

بیگم۔ (پیالی میں چاء انڈیلتے ہوئے) منصور! (اتنے زور سے پکارتی ہیں کہ بچہ گھبرا جاتا ہے اور پیالی کو ہاتھ سے گرا دیتا ہے) نیکی اترے تمہارے اوپر، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہو اب تو کلّے چھیلنے سے باز رہو۔ آخر یہ روز روز ششو کرنے سے فائدہ کیا؟

پروفیسر۔ (اس طرح جیسے سنا ہی نہیں) منصور!

منصور۔ جی پاپا!

پروفیسر۔ بیٹا تم نے ہماری قمیض میں رفو کر دیا۔

منصور۔ (خاموش)

بیگم۔ بیٹا منصور! تمہاری قمیض پرانی ہو گئی ہے رفو کی گنجائش ہی نہیں۔

پروفیسر۔ ہونہہ۔ دل میں نہ ہو گی۔ قمیض میں تو ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں منصور!

بیگم۔ قمیض سوئی کی ایک نوک بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ دل طعنوں اور چٹکیوں کے سینکڑوں نشتر برداشت کر سکتا ہے۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں منصور!

پروفیسر۔ بیٹا لاؤ میں اس قمیض کو پھاڑ ڈالوں۔

بیگم۔ پرانی چیزوں کا یہی مصرف ہے منصور!

پروفیسر۔ کاشکہ پرانی بیویوں کا بھی یہی مصرف ہوتا۔

بیگم۔ اسی کے ساتھ پرانے شوہروں کا بھی۔

[پروفیسر خاموشی کے ساتھ حمام کا رخ کرتے ہیں۔ دردانہ اور ریحانہ ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتی ہیں اور میز پر سے اٹھ کر بیگم کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہیں]

دُردانہ۔ اے باجی!

ریحانہ۔ اے باجی!

بیگم۔ کہو!

دُردانہ۔ (مسکرا کر) منصور آپ کا بہت شریر معلوم ہوتا ہے۔

بیگم۔ کیوں۔ کیا ہوا؟

ریحانہ۔ دولھا بھائی کی قمیض میں رفو نہیں کرتا۔

دُردانہ۔ شیو کیے جاتا ہے داڑھی نہیں رکھتا۔

بیگم۔ (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) اب میری زندگی کا سہارا منصور ہی تو ہے ہم دونوں کے درمیان مغائرت اور نفرت کی ایک دیوار حائل ہو گئی ہے، جو گر نہیں سکتی۔ ہاں بڑھ سکتی ہے۔ تین سال سے یہی عالم ہے۔ البتہ منصور ایک سوراخ کا کام دیتا ہے جس کے پردے میں ہم ایک دوسرے سے مطلب کی بات کہہ لیتے ہیں۔ اگر منصور نہ ہو تو میں خاموشی کا روزہ رکھ لوں۔

ریحانہ۔ یہ کشیدگی کس بات پر ہوئی؟

بیگم۔ بلا وجہ!

دُردانہ ۔ آپ دونوں کی محبت تو شہر بھر میں مشہور تھی۔

ریحانہ ۔ محبت کی افراط کا یہی حشر ہوتا ہے۔

بیگم ۔ اب دلوں میں گرہ پڑ گئی ہے۔ ایک دن اٹھ کھڑی ہونگی۔

(آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اُٹھ کر مُنہ دھونے جاتی ہے)

دُردانہ ۔ چلو ان دونوں میں ملاپ کرا دیں۔

ریحانہ ۔ یوں کہو کہ جنگ کرا دیں۔

دُردانہ ۔ کیوں؟

ریحانہ ۔ تاکہ خود بخود ملاپ ہو جائے۔ جانتی ہو سوتی ہوئی محبت کو بیدار کرنے کے لئے اور جاگتی ہوئی دشمنی کو سُلانے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے؟ جنگ کی! یہ لوگ بہت زیادہ خود دار ہیں۔ خطاؤں کو دل میں رکھ کر پرورش کرتے ہیں اور پھانس کا بانس بنا دیتے ہیں۔ دل کھولتا ہے جس میں ابخرات آتش فشاں پہاڑ کا مادہ بن جاتے ہیں۔ ان کو نکلنے کا راستہ ملتا نہیں اس لئے طبیعت میں زلزلے آتے رہتے ہیں طبیعت اور پانی دو چیزیں ہیں جن کا رکنا طوفان اور سیلاب لاتا ہے۔ اس لئے دور دُھکے ہوئے دوستوں میں ملاپ کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا دو اور لڑا دو۔ دل کھول کر گرم گرم آنسو جلتی ہوئی آہیں اور سُلگتی ہوئی سسکیاں محبت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دینگی اور یہ سرد مہری چشم زدن میں گرما گرمی

میں تبدیل ہو جائیگی۔

دُردانہ۔ ماشاء اللہ زبان کیا ہے۔ لطافت و شیرینی کا دریا ہے۔ اچھا، کون سا بمب چھوڑو گی؟

ریحانہ۔ بمب کی ضرورت نہیں، میں پروفیسر کے چابی بھرتی ہوں۔ اور تم باجی کے بھرو۔ اس کے بعد ہم تم دونوں اس ڈرامے میں بلا ٹکٹ بیٹھ کر لطف اٹھائینگے۔

دُردانہ۔ سمجھی!

[بیگم چاء بنا کر لاتی ہے اور منصور کے ہاتھ میں دیکر پروفیسر کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے وہ جاکر میز پر رکھ آتا ہے۔ پروفیسر حمام میں سے نہا کر کمرہ میں داخل ہوتا ہے]

دُردانہ۔ (ریحانہ کی طرف دیکھتے ہوئے) باجی کچھ اور بھی سُنا؟

بیگم۔ کیا؟

دُردانہ۔ بھائی عرشی کو خان بہادر کا خطاب ملنے والا ہے۔ کیوں ریحانہ! اگر باجی کی شادی وہاں ہوگئی ہوتی تو؟

بیگم۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بہن! میری قسمت میں تو پھٹی ہوئی قمیضوں کو رفو کرنا لکھا ہوا تھا۔

پروفیسر۔ (چائے کی پیالی کو میز پر رکھ کر) پھر ان کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ کیا میں نے خوشامد کی تھی۔؟

بیگم ۔(کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) کیا اب مجھے ملعون کہنے کا ارادہ ہے۔
یہ جان دینے اور خود کو مٹا دینے کا ثمرہ مل رہا ہے۔ خدا تم سے بدلہ لے۔

ریحانہ ۔اے کیوں بیکار لڑتے ہیں آپ دونوں جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا۔

دُردانہ ۔(بناوٹی غصّہ میں) تم بڑی وہ ہو۔ تم کو کیا ضرورت تھی کہ بھولے ہوئے افسانے دہرا کر باجی کے زخموں پر نمک مرچ چھڑکو۔

بیگم ۔دم بخود بیٹھی رہتی ہوں۔ بات کرنی ہی چھوڑ دی ہے۔ اس پر بھی یہ حال ہے کہ گلا دبانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

دُردانہ ۔صبر کیجئے بہن! ہم ہندوستانی عورتوں کے لئے دنیا جہنم ہے مردوں کی فرعونیت کی انتہا ہو گئی ہے۔ جب یورپ کی رٹ لگاتے رہتے ہیں اگر وہاں پہنچا دیئے جائیں تو دوسرے ہی دن بلا ٹکٹ وہاں سے واپس آجائیں۔

پروفیسر ۔یہ خاکسار کی طرف اشارہ ہے۔ کیا تم کو علم نہیں کہ "میں انجمن تحفظ حقوق نسواں" کا صدر ہوں۔

دُردانہ ۔یہی تو اور بھی رونا ہے۔ بھیڑوں کے گلے بان بھیڑیئے بن گئے ہیں۔ میں آپ کو نوٹس دیتی ہوں کہ میں ایک ایسی ہی دوسری انجمن بناؤنگی اور اس کا صدر باجی کو کر دونگی تاکہ اس کھال کے خول اور ہڈیوں کے مالا کو دیکھ کر......"

پروفیسر۔ تم کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

دُردانہ۔ سچی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

بیگم۔ حق کیوں نہیں ہے! کیا میرا کوئی اور بیٹھا ہے۔ اکیلا پاکر شیر ہوگئے

دُردانہ۔ میں صدقے ہو کر تمھارے اوپر سے مرجاؤں باجی! تمھاری فکر میں گھلی جاتی ہوں۔

پروفیسر۔ پھر کیوں نہ خان بہادر سے شادی کرادی۔ تم ہی پیش پیش رہتی تھیں اور مجھے اکسایا کرتی تھیں کہ ــــــــ

دُردانہ۔ یہ بھی برائی ہوگئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ایسے بدل جائینگے۔

پروفیسر۔ مجھے پھنسا دیا۔

بیگم۔ یعنی۔؟

پروفیسر۔ مجھ کو ہندوستانی زبان درازی کا شکار مت بناؤ۔

بیگم۔ میں سمجھی جو تمھارا مطلب ہے۔

پروفیسر۔ پھر کیوں انجان بن کر پوچھ رہی ہو۔

بیگم۔ افسوس! میری قربانیاں بیکار گئیں۔ میں نے اس شخص کیلئے جائداد پر لات ماری۔ دولت کو ٹھکرایا اور حکومت سے منہ موڑ لیا۔ کاش میرے وہی دن پھر واپس آجائیں۔ آہ، مجھکو کیا معلوم تھا کہ مجھے پھٹی ہوئی قمیضیں سینا پڑینگی۔

دُردانہ - ہاہ - (آنسو نکالنے کے لئے قریب رکھی ہوئی مرچ آنکھوں سے لگاتی ہے ریحانہ ہنسی کو روکنے کیلئے رومال مُنہ پر رکھتی ہے)

پروفیسر - خدا کی قسم تمھاری قربانیوں کی داستان سنتے سنتے عاجز ہو گیا ہوں (پیالی پٹک کر) کیا میں نے تمھارے ساتھ شادی کر کے اپنے پاؤں میں کلہاڑی نہیں ماری - ارے میں آج گورنر ہوتا - نواب چھتاری - سر محمد عثمان اور سر سکندر حیات خاں کی طرح -

بیگم - شیخ چلی -

پروفیسر - میری ذہانت، ذکاوت اور عقلمندی کا سکہ سارے خاندان پر بیٹھا ہوا تھا ہر شخص کہتا تھا کہ میں بہت ترقی کرونگا - کیوں ریحانہ بولتی کیوں نہیں ہو - آج میں گورنر ہوتا یا نہیں ؟

ریحانہ - اس میں بھی کوئی شک ہے - میں کہتی ہوں کہ آپ کی گورنری اس شان کی رہتی کہ لوگ واجد علی شاہ کی حکومت کو بھول جاتے - آپ جس وقت بی - اے پاس ہوئے ہیں اُس وقت شہر کے بڑے بڑے رئیس آپ کو ایک ہاتھ سے لڑکیاں دینے پر تیار تھے اور دوسرے ہاتھ سے دولت، آنریبل سر .... آپ کے پیچھے پیچھے اپنی لڑکی کی تصویر لئے پھرتے تھے - (ہنسی کے روکنے کے لئے کھانستی ہے)

پروفیسر - ہاں مجھ کو انگلینڈ بھیج رہے تھے، بیرسٹری کی تعلیم کیلئے،

ہائے ہائے، وہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ بی۔اے۔پاس تشنہ ملازمت رہیں اس وقت میں اگر آئی۔سی۔ایس۔میں بیٹھتا تو ساری سلطنت برطانیہ میں اول نمبر آتا۔شان سے ڈپٹی کمشنری کرتا اور چند سال کے بعد گورنر بنا دیا جاتا۔تقدیر نے کہاں جاکر دھوکہ دیا ہے۔آج ہندوستان کو حقوق مل رہے ہیں۔اس موقعے پر نہ ہوا میں ورنہ وائسرائے ہونے کا نمبر میرا ہی تھا۔

ریحانہ۔آپ پر اس وقت شادی کا جن سوار تھا۔بھیا میں تو کہتا چاہتی تھی کہ تم ولایت جاؤ۔مگر کسی سے کہہ نہ سکتی تھی کیونکہ میری کون سنتا۔اپنی قسمت ہی میں نہ تھا کہ گورنر کی بہن کہلائے جاتے۔آہ۔

بیگم۔ابھی آنکھ نہیں کھلی شاید۔ہز اکسیلنسی سر محمد محمود صاحب بہادر۔ایم بی۔اے۔وائی۔ایکس دام اقبالہم!۔میاں دن رات قبض کے مرض میں گرفتار رہتے ہیں اسی منہ سے وائسرائے ہوتے۔

دردانہ۔خالی ذہانت کس کام کی۔جب تندرستی ہی نہ ہوئی۔

بیگم۔خالی خولی ایک سرٹیفکیٹ پر اترائے جاتے ہیں تمہارے ایسے ہزاروں بی۔اے پاس سیٹھ بہاری لعل کونسلی کے پاس ناک رگڑنے جاتے ہیں۔اچھا یہ بھی سہی کہ تم گورنر ہوجاتے تو میں عرشی کو دہلی کی اسمبلی کا صدر بناتی۔جس سے گورنر تو گورنر وائسرائے تک خوف کھاتے۔

پروفیسر۔ عرشی کو ؟

بیگم ۔ ہاں اور کیا تم کو ؟ وہ اپنے گھر کا رئیس ہے اور ایک بڑے کارخانے کا مالک ہیں اگر پردہ ترک کر دیتی اور پبلک میں کھڑے ہو کر لکچر دیتی تو کس کی مجال تھی کہ وہ کسی دوسرے کو ووٹ دیدیتا ۔ تم خود اس بات کو مانتے ہو کہ ولایت میں عورتیں ہی اپنے خاوندوں کو پارلیمنٹ میں پہنچا دیتی ہیں ۔

پروفیسر ۔ جاہل محض ، جسے دستخط کرنا بھی نہیں آتا وہ دہلی کی اسمبلی کا صدر رہوتا ۔

دردانہ ۔ اے پڑھ لیتے ۔ انگریزی بول لینا لوہے کے چنے تو ہیں نہیں ،

پروفیسر ۔ خیر یہ بھی مانا لیکن اگر میں گورنر ہوتا تو اس کو کانگریس پارٹی سے تعلق رکھنے کی بنا ، پر جیل بھجوا دیتا رہ جاتی سب صدارت ۔

بیگم ۔ (سر پیٹ کر) ہے ہے اتنا ظلم ، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے سنگدل ہو ۔

پروفیسر ۔ خیر ، اگر تم خوشامد کرتیں تو ان کو رہا کر دیتا اور محض تمہارے خیال سے کہ چلو بھئی چچا کی لڑکی ہے ان کو آنریری مجسٹریٹ کر دیتا ۔ یا کسی دُور دراز کے معمولی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر ۔

بیگم ۔ معمولی ضلع کا اور وہ بھی دور دراز ۔

پروفیسر ۔ اچھا بھئی بریلی کا ۔ زیادہ مہربانی کرتا اگر ۔

بیگم۔ (آنکھیں پھاڑ کر) بریلی سارے بریلی میں کیا رکھا ہے۔ سوائے ہاشم کے سُرمے اور مدّو کے تخت کے۔ میں تو ایسی جگہ کبھی بھی نہ رہتی۔

پروفیسر۔ خیر پیلی بھبیت سہی۔

بیگم۔ کالی، پیلی، بھبیت، وہاں رہنے والوں کے نیلے ہاتھ پیر۔

پروفیسر۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

بیگم۔ میں تو لکھنؤ کی ڈپٹی کلکٹری لیتی۔ وہاں تعلقداروں اور نوابوں کی بیگموں کے ساتھ لطف صحبت رہتا۔ شام اودھ کے نظارے رہتے اور زبان کی شیرینی اور حلاوت کے لُطف۔

پروفیسر۔ (غصّہ میں) میں کبھی ہرگز لکھنؤ نہ دیتا۔ وہاں میں خود رہتا۔

بیگم۔ تمہیں لکھنؤ دینا پڑتا۔

پروفیسر۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ میں لکھنؤ کبھی نہ دیتا۔ زیادہ ضد اچھی نہیں ہوتی ہے۔

بیگم۔ (سر پیٹ کر) ارے تمھارے زمین دیتی۔ کیا چچیرے بھائی اور منو کا اتنا بھی حق نہ تھا۔ سب سے خون سفید ہو گیا۔ خدا کی قسم میں وائسرائے تک پہونچتی۔ اور اس کی بیگم سے مل کر لکھنؤ کا تبادلہ کرا لیتی۔ ورنہ تمھارے خلاف جلسے کراتی۔ اخباروں میں اشتہار دلواتی۔ اور تمھارے خلاف ایک بمب بنانے کا کارخانہ کھلوا دیتی۔

پروفیسر ۔ (کھڑے ہوکر) بندہ ان گیدڑ بھبکیوں میں نہیں آتا۔ فرض اور حکومت کے معاملہ میں عزیزداری کا خیال کرنا عبث ہے۔ میں دنیا کے سامنے ایمانداری اور انصاف کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرنے کے لئے عرشی کو کالے پانی بھجوا دیتا ہوں۔ ادھو میرے تمام دانت نکل پڑے ۔

بیگم ۔ (روتے ہوئے) یہ مار آستین ہے۔ بس صاحب ہوگئی۔ ہم کو کالے پانی بھیجا جا رہا ہے۔ آہ دنیا سے انصاف اٹھ چکا ہے ۔

[دردانہ اور ریحانہ حائل ہونے کے بجائے کمرے میں سے اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ لڑائی خوب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں بیدم ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ خوب روتے ہیں اور بغیر کھانا کھائے سو جاتے ہیں ۔]۔

(عصمت)

آغوشِ فطرت میں!

میرے ایک ہندو دوست قبض کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور اس کے بعد دواؤں کے خیال میں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

آخر کار فطری علاج کی طرف مائل ہوئے اور "امریکہ فزیکل کلچر میگزین" کے ایڈیٹر میکفڈن سے رجوع کیا۔ اس نے تندرستی اور صحت کے اصول پر بارہ جلدوں کی ایک ضخیم قاموس بھیجدی جسے پڑھنے کے لئے ان کو ایک سال کی مدّت درکار ہوئی۔ اب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ رگ پٹھے اور جوڑوں کی تشریح میں ماہر ہو گئے لیکن اس مزید عرق ریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرض نے جڑ پکڑ لی۔ آخر کار مایوس ہو کر میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میاں تندرستی کے اصول تو بہت سیدھے سادے ہیں اور فطرت نے تم کو سکھلا بھی دیئے ہیں مگر افسوس ہے کہ تم ان کو فلسفہ اور سائنس میں تلاش کرتے پھرتے ہو۔

کہنے لگے تم بھی فطرت کی طرح ستم ظریفی کر رہے ہو۔ میں غذا تول کر کھاتا ہوں گلاس ناپ کر پانی پیتا ہوں۔ گھڑی کے حساب سے سوتا ہوں۔ اور الفاظ گن کر

بولتا ہوں۔ خیالات کو پاک رکھنے کے لئے آنکھوں پر سیاہ عینک لگا کر راستہ چلتا ہوں تاکہ تمام حسین چہرے سیاہ رو نظر آئیں۔ قوت کو برقرار رکھنے کے لئے بیوی کو طلاق دیدی ہے اور نوکری کو استعفیٰ دیچکا ہوں۔ مزید براں تازہ ہوا کی آمدورفت کے لئے میں نے مکان کی چھت اتار دی ہے اور دیواریں منہدم کرادی ہیں۔ جراثیم کو ہلاک کرنے کیلئے سپرٹ کے ٹب میں غوطہ لگاتا ہوں اور فینائل سے دیواروں کو معطر رکھتا ہوں۔ چھوت کے مسئلہ پر اس حد تک اعتقاد رکھتا ہوں کہ میرے دوست مجھکو اچھوت خیال کرتے ہیں اور میں ان کو۔ یہی وجہ ہے کہ میں جو مہاتما گاندھی کے پرستاروں میں تھا۔ اب اُن کے مخالفین میں سے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا وجود سوسائٹی کی تندرستی کیلئے پلیگ کے کیڑے کی طرح خطرناک ہو رہا ہے۔ بہرحال میں اشد ضرورت پر ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے پہن کر شیک ہینڈ کرتا ہوں اور سال میں ہولی کے موقع پر صرف ایک مرتبہ چند آدمیوں کے گلے مل لیتا ہوں۔ وہ بھی اس طرح، کہ میرے مُنہ کے اوپر اسٹرلائیزڈ جالی لگی رہتی ہے اور وہ دوست بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر، حکیم، عطار اور کمپونڈر ــــ لیکن باوجود ان تمام تدابیر کے میں کمزور ہوں اور مرض زوردار۔ اب عاجز آکر میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ "نارلیتن کلب برلن" کے سکریٹری کی طرف رجوع کروں تاکہ وہ مجھے "برہنگی" کے فوائد پر لٹریچر روانہ کرے۔ اتنا سرمایہ میرے پاس نہیں کہ میں

ہنس کر کہنے لگے کہ "اول تو یہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ سڑکوں پر نیم برہنگی کے مظاہرے تو اب بھی ہوا کرتے ہیں جو کلی برہنگی کے مقابلہ میں زیادہ زہد شکن ہیں۔ آستین، گریبان، پلو اور پائجامے کے پائینچے مفقود ہو چکے ہیں اور فی زمانہ لباس کی حیثیت مرکزی رہ گئی ہے اور اس طرح ہمارے منزل مقصود تک پہونچنے کیلئے بہت سی آسانیاں مہیا ہو چکی ہیں۔ رہ گئی، مخالفت۔ مخالفت کے نقطۂ نظر سے تو جناب آپ مجھے اتنا عرض کرنے دیجیئے کہ مسلمان باجے کی مخالفت کرتے آئے ہیں اور ہندو گوشت کی لیکن نہ یہ متاثر ہوتے ہیں اور نہ وہ۔"

"کیا سناتنی گروہ بھی خاموش رہیگا"؟

سناتنی گروہ اگر واویلا مچائیگا بھی تو کیا کریگا۔ مذہبی حیثیت سے خاموش ہونا پڑیگا اور سماجی نقطۂ نظر سے پسپا۔ کیونکہ وہ لوگ تو بدھوا بواہ، سیول میرج اور مہاتما گاندھی کے اچھوت سدہار سکیم کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔"

"مگر ہمارے جذبات کا کیا حشر ہوگا اور مسلمانوں کے جذبات کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟"

"چہ خوش، ــــ آپ پردہ کی مخالفت بھی اسی بنا پر کیا کرتے ہیں۔ بھائی رفتہ رفتہ عادت ہو جائیگی۔ اس کے علاوہ آپ مجھے تبلایئے کہ آپ امریکہ کی فلمیں کیوں دیکھا کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہر سینما گھر میں اکثریت مسلمانوں ہی کی ہوتی ہے جہاں جذبات کا قتل عام ہوتا ہے ــــ بہرحال ہم آپ کی ہمدردی حاصل کرنے

کے لئے اس حد تک تیار ہیں کہ یورپ کے مرتب کئے ہوئے دستور العمل میں تھوڑی سی ترمیم کردینگے۔"

"یعنی ؟"

"لباس کی حدود متعین کردی جائینگی اور اس متعینہ پیمائش سے زیادہ متجاوز ہونے کا کسی کو حق نہ دیا جائیگا۔"

"ورنہ !"

"ممبری سے اخراج۔"

"اس کی کیا صورت اختیار کی جائیگی ؟"

"چند ممبروں کے پاس ایک اسکیل رہا کریگا جس کے ایک طرف انچیں اور دوسری طرف سنٹی میٹر کے نشانات ہونگے ـــــ یہی ہماری پولیس ہوگی جو کلب کے اصول کی حفاظت کا اہم مقصد انجام دیگی۔"

"آپنے اپنے کلب کے لئے کونسا مقام تجویز کیا ہے ؟"

"ایسا مقام جو ہندوستان میں سب سے زیادہ مہذّب ہو اور وہ میرے خیال مین بمبئی ہے۔ یہاں ہم کو پارسیوں سے دامے، درمے، قدمے، سخنے، مدد ملیگی اور ہماری سکیم بہت جلد بار آور ہو جائیگی۔"

"آپ بمبئی ہی میں اس کا پروپگنڈا کیوں نہیں کرتے ؟"

"صرف اس لئے کہ ہندوستان کے دار السلطنت دہلی ہی میں ہم اس کی

ابتدا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مجلس قانون ساز کے اراکین میں سے چند لوگ ہمارے شریک ہو جائیں تو ہمارا بل پاس ہو جائیگا۔"

"آپ خود عملاً اس کا پرچار کیوں نہیں کرتے؟"

"چونکہ میرے قویٰ بہت کمزور ہیں اس لئے میں پبلک اور پولیس کے ڈنڈ و ں کا تختۂ مشق بننا پسند نہیں کرتا۔"

"مگر میں آپ کی مدد کیا کر سکتا ہوں"؟

"اگر آپ قبض کے مریض ہیں تو میرے ہم خیال بن جائیے۔"

اس موقع پر پہونچکر مجھے مصلحت آمیز جھوٹ بولنا پڑا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں بھی کبھی کبھی مبتلا ہو جاتا ہوں اور میں کیا ——— شیکسپیر کے قول کے مطابق کہ "ہر وہ دوسرا آدمی جس سے میری ملاقات ہوئی ایک دل پھینک عاشق تھا"۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ "ہر وہ تعلیم یافتہ جس سے میری ملاقات ہوئی قبض کا مریض تھا"۔ لیکن چونکہ میں ہرگز ہرگز ان کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے ان سے کہا کہ

"میں خدانخواستہ اس مرض کا مریض نہیں ہوں"۔

کہنے لگے۔ "اگر اب نہیں تو ہو جائینگے"۔

میں نے کہا کہ۔ "پھر دیکھا جائیگا"۔

آخرکار انھوں نے مجھکو اپنی دوستی کا واسطہ دلاتے ہوئے استدعا کی کہ

میں دہلی کے کسی اہم اور کثیر الاشاعت رسالہ کے ذریعہ قبض کے مریضوں کی مردم شماری کی تحریک پیش کروں۔ چونکہ اس میں ظاہرا کسی خطرے کا امکان نہیں اس لئے میں ایڈیٹر شاہجہاں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ پر اپنے ناظرین سے ریسرچ کرنے کی تحریک پیش کریں۔ آخر میں میں علی الاعلان عرض کرتا ہوں کہ مجھے "برہنہ کلب" سے نہ تو کسی قسم کا سروکار رہا ہے، نہ رہا ہے اور نہ آئندہ رہنے کی امید ہے۔ اس لئے میں اس مسئلہ پر بحث وتحیص میں حصہ لینے سے محترز رہونگا۔

(شاہجہاں)

پان کار

نوٹ:۔ سنسکرت میں آرٹسٹ کو روپ کار کہتے ہیں جس کا درجہ ایک بازاری مصور سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اسی طرح پان بنانے والے کو آرٹ کے نقطۂ نظر سے پان کار کہنا نہ تو ادبی غلطی ہے نہ فنی۔ البتہ بنواڑی اور تنبولی سے ممیز کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب ذیل کا مضمون دیگا۔

ہندوستانیوں کے محبوب ترین مشغلے دو ہیں۔ پان اور شعر، اول الذکر مخصوص طریقے سے جنس لطیف کا مرہون منت اور آخر الذکر جنس قوی کی تخلیق۔ پان کار مرد اور شعر کہنے والی عورتیں مستثنیات سے ہیں۔

حالی اور اسمٰعیل میرٹھی نے شعر اور مشاعروں کی بھرمار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ لیکن پان اور پاندان کے خلاف تمام نوجوان طبقہ کمر بستہ ہے جن میں ایک ہماری ذات ہی مستثنیٰ ہے۔

دراصل پان کی تعریف میں قصیدے کہے جا سکتے ہیں لیکن جو چیز کہ اس کے خصائص پر عیوب کا پردہ ڈالے ہوئے ہے وہ اس کی سرخ پچکاری ہے۔ جس نے اس کو داغدار بنا دیا ہے۔ مگر حافظؔ کہہ چکے ہیں۔ ؎

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است
بلکہ می بیشود از صحبت ناداں بدنام

یہی شعر برگ تنبول کے مخالفین کیلئے جواب مسکت کا کام دیسکتا ہے۔

حقایق بین نظروں کے لئے شعر اور پان دو جداگانہ چیزیں نہیں بلکہ جذبات کے نقطۂ نظر سے پان شعر ہے اور شعر پان۔ ظاہری صورت میں بھی ان دونوں میں ایک قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جس طرح شعر کے لئے ردیف اور قافیے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح پان کے لئے کتھے اور چونے کی۔ وزن کے لحاظ سے ان دونوں اجزا کا تناسب بھی بیحد ضروری ہے ورنہ شعر تقطیع سے آزاد ہو جائیگا۔ اور پان ذائقہ سے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ آدھا پان جس کو عرف عام میں کتر کہتے ہیں دراصل مکمل شعر نہیں بلکہ ایک مصرعہ کہا جا سکتا ہے۔

جس طرح شعر محاکات سے آزاد ہو کر بھی اپنی مخصوص بحر سے آزاد نہیں ہوتا اسی طرح پان کی زمین بھی اپنے لوازمات سے علیحدہ ہو کر ایک خاص بحر کے ماتحت رہتی ہے اور یہ دراصل اس کا فطری ذائقہ ہے۔ مدراسی۔ بنگلہ۔ بیگمی۔ پونوی وغیرہ خاص خاص ماحول کے لحاظ سے جداگانہ بحروں کے مالک ہیں۔

اب رہا شعر کا ترنم سو وہ بھی پان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور یہ اس کی ذائقہ نوازی اور لبوں کی سرخی ہے جو بیک وقت باصرہ نوازی کا مقصد بھی انجام دیتی ہے۔ گویا پان کے اندر شعر کے وجدان کے شانہ بشانہ مصوری اور موسیقی

کے تاثرات بھی موجود ہیں اور اس طرح پان آرٹ کی جملہ اصناف کا مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

شعر کے نقطۂ نظر سے الائچی۔ تمباکو۔ اور ڈلی زوائد تو نہیں کہے جا سکتے لیکن لوازمات کی صف میں بھی شمار نہیں کئے جا سکتے۔ ناریل، چکنی ڈلی۔ سونف زیرہ اور دوسری قسم کی تپیاں دراصل حشو زائد ہیں جو شعر کی صف سے نکال کر پان کو معر بنا دیتی ہیں۔ اور واقعی ایسے لوگ مذاق سلیم کی گردن پر چھری پھیرنے کے ملزم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ دراصل پان نہیں کھاتے بلکہ پان کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ ان زوائد کی ایجاد کا سہرہ اہل مدراس اور بمبئی کے سر ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ "یونانی دواخانہ دہلی" سے برگ سنا مکی اس میں اور شامل کرا لیتے۔ تاکہ اس "ملین نسخہ" کے اجزا مکمل ہو جاتے۔

آخر میں محاکات شعر کے ضمن میں وہ چیز رہ جاتی ہے۔ جو دراصل شعر کی روح ہے۔ اور جس کے پردہ میں شاعر کی دلی کیفیات کا موجیں مارتا ہوا سمندر سامعین یا ناظرین کو ایک زبردست وجدانی رو کے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ یہی روح پان کا عطر ہے جو ؏ ایں سعادت بزور بازو نیست، کے مصداق ہر پان میں نہیں پائی جاتی۔

جس طرح ہر تک بند شاعر اور ہر بوالہوس عاشق نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہر صاحب پاندان "پان گار" بھی نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ بعض

اہلِ ذائقہ پنواڑن اور تنبولن کو پیش کریں۔ میں ان کی خدمت میں بصد ادب عرض کرونگا کہ خدا کے لئے اس امر کو نظر انداز نہ کیجئے کہ پان اپنے جسم میں "شعریت" رکھنے کے علاوہ ایک دوشیزہ کی طرح عفت و عصمت کا حامل بھی ہے۔ جس کی تلاش کیلئے دوکان اور بازار کا چکر لگانا اس کی ذلت و تحقیر کرنا ہے۔

اسی ضمن میں پنواڑن اور تنبولن کا ایک لطیف فرق بھی ملحوظ خاطر رہے، اول الذکر صرف سادے پان فروخت کرتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک پان کار کے مقابلے میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے اقبال کے سامنے کسی پیپرل کٹے اکھنٹ کی یا کسی حسین دوشیزہ کے سامنے قنوج اور لکھنؤ کے عطر کے کارخانوں کی تنبولن دراصل بنے ہوئے پان فروخت کرتی ہے لیکن ان کا درجہ ایسا ہی ہے جیسا غالب کے کسی اعلیٰ شعر کے سامنے "چنے جور گرم لایا ملائم مجیدار" کا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ انہیں کے ساتھ اپنی عفت و عصمت بھی بازار میں لے آتی ہے۔

پان کا لطف اٹھانے کے لئے دانت اور زبان کی ضرورت نہیں بلکہ دل کی ضرورت ہے۔ مارواڑی کی تھیلی کی طرح کلہ دان میں اس کی لبدی اس طرح نہ رکھی جائے کہ آپریشن کی نوبت آئے۔ اس کے برخلاف پان کھایا چبایا نہیں جاسکتا۔ چنوں اور جوار کی طرح، بلکہ محلول کیا جاتا ہے خون میں اجزاء، باجزاء رنگ بہ رنگ تا آنکہ لہو بن کر جذبات سمیت روح میں تحلیل ہو جائے۔ اس کی سرخی کو پیپڑی کی شکل میں باچھوں تک لے آنا گویا پان کو شہید کرنا ہے

پپڑائے ہوئے ہونٹ ہنگامہ خیز قہقہے کے مترادف ہیں جن سے چہرہ کی ہیئت کذائی بربریت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ زیرلب تبسّم، چشم نیم باز، نیم وا چہرہ اور ہلکے گلابی ہونٹ تاثرات کے لحاظ سے قیامت ہیں اور ہنگامۂ مجسّم۔

پانوں کی تھالی میرے لئے ایک بزم مشاعرہ ہے جن میں پانوں کی گلوریاں انواع و اقسام کی نظموں کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ مجھکو اپنے لطیف اجسام کی کشش سے خود پر اس طرح مائل کر لیتی ہیں کہ میں ایک گلوری کے عوض عمر خیام کے چھلکتے ہوئے جام اور حافظؔ کے "خال ہندو" کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔

میرے نقطۂ نظر سے ہندوستان میں تہذیب و تمدّن کا معیار کوئی اور شے ہو ہی نہیں سکتی مگر پان، مہذب شخص وہ کہلائے جانے کا مستحق ہے جو پان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہو اور "پان کاروں" کی ہمت افزائی کرنا جانتا ہو۔

اس فن لطیف کو لطیف تر بنانے کا سہرا جیسا کہ میں شروع میں اشارۃً کہہ چکا ہوں جنس لطیف کے سر ہے اور اس کے ارتقاء میں سہولتیں مہیا کرنا ہم مردوں کا فرض۔ افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی، شاعری اور مصوری جیسے فنون لطیفہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ اُس کا انحطاط بھی ہو رہا ہے، انگریزی تہذیب نے جہاں ہندوستان میں سگریٹ کو پیچوان کے مقابلہ میں سلگا یا ہے

اسی ضمن میں "لبوں کی مصنوعی سُرخی" سے پان کو مات دی ہے۔ یہاں تک۔ کہ آخرالذکر کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا ہے۔ یہ وبا اس حد تک ترقی کر گئی ہے۔ کہ میری محترمہ نے بھی پاندان کو باورچی خانہ میں لیجا کر نمک، مرچ اور گرم مصالحہ کی ہانڈی بنا دیا ہے اور اس کے بجائے غازے اور سرخی کی شیشیوں پر اپنی تمام توجہ منعطف کر دی ہے۔ میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس فن قدیم کو برباد ہوتے دیکھ کر میرے ہم آہنگ ہونگے اور لبوں کی سرخی کے خلاف حتی المقدور کوشش بلیغ فرمائینگے۔

ہندوستان میں اس دور انحطاط میں بھی کثرت سے ایسے خاندان ہیں جو پان سے شوق رکھتے ہیں اور اس فن کو باقی رکھنے کا ذوق۔ لیکن اُن کی حیثیت ایک نادان دوست کی سی ہے۔ انھوں نے جس طرح فن شاعری کو گل و بلبل کے افسانوں میں محدود کر دیا ہے۔ مصوّری کو کلینڈر کی تصویروں میں مقید اور موسیقی کو ہارمونیم کی الاپ میں منتقل کر لیا ہے۔ اسی طرح پان کو ملغوبہ اور پچکاری بنا لیا ہے۔ بکری کی طرح جگالی کرنا۔ بطخ کی طرح ہونٹھوں کو اس کے لعاب سے آلودہ کرنا۔ مرغی کی طرح در و دیوار کو داغدار بناتا اور خود کے اور دوسروں کے لباس پر گلکاری کرنا دراصل ہندوستانی تہذیب کا گلا گھونٹنا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ زمانۂ قدیم کی ململ اور چاندنی عصمت مآب تھی اور اگالدان عیب پوش۔

گوشت خورہ کی فراوانی بھی اُس کے خلاف ایک زبردست ہتھیار ہے۔
کاش کہ دانتوں کا کوئی دنگل منعقد کیا جاتا تو فوراً معلوم ہوجاتا کہ کس کی ہڈی مضبوط ہے دانتوں کی جڑیں سُرخ پانی سے مضبوط ہوتی ہیں۔ ان کا معدہ ڈلی کے ٹکڑوں کو پیسنے سے طاقتور اور ان کے جراثیم چونے کے انجکشن سے ہلاک۔ البتہ اگر چونے کی ڈلیوں کو لعاب دہن میں بجھا دیئے جائیں اور کتھے کے رنگ کی آمیزش سے دانتوں پر متواتر پلاسٹر چڑھائے جائیں تو اس کیمیاوی عمل سے جو کچھ نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔
بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لیکن جس طرح شعر کہنے اور شعر پڑھنے میں فرق ہے اسی طرح پان بنانے اور پان کھانے میں بھی فرق ہے۔ پان کاری کا فن سینہ بسینہ ہر ماں سے لڑکی تک بطور ورثہ پہونچتا ہے۔ ہندوستان میں معدودے چند ایسے خاندان ہیں جو اس کی قدیمی خصوصیات کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔
مثلاً ڈلی ہی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ اس کا کترنا کھیل نہیں ہے۔ ہم نے جب کبھی کوشش کی انگلی کو شہید کرلیا۔ کیونکہ ہمارے ہاتھ میں سروتہ اور عورتوں کے ہاتھ میں استرہ خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ عورتوں کے لئے مخصوص طریقہ سے سروتہ کا شغل بیحد دلچسپ ہے اور مفید۔ رات کے گہرے سکوت میں جب تمام عالم محو خواب ہو تو سروتے کے تال کی آوازیں موسیقی کا لطف

دیتی ہیں۔ جس طرح سگریٹ کے دھوئیں کے پیچ وخم میں ہم مضامین کے جلووں
کی پاشانی دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں اس کی آواز میں ایک خاص رومانی
کشش محسوس کرتی ہیں۔ اور اکثر ان اوقات میں خاموش بیٹھ کر کسی دوسرے
عالم میں پہونچ جاتی ہیں۔

غرضکہ سروتہ خلوت میں ان کا مونس ہے اور جلوت میں ان کا ہم جلیس۔
لیکن اگر دس پانچ سروتے ایک مقام پر مجتمع ہو جائیں تو ایک قسم کا ہنگامہ برپا
کر دیتے ہیں اور یہ پان بنانے کا کارخانہ مصیبت عظمیٰ بن جاتا ہے۔ میرے
ایک دوست کی محترمہ جب اپنے شوہر سے ستیہ گرہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی
ہیں تو مکان میں ڈلی کاٹنے کی ایک مجلس منعقد کر دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
میرے دوست یا تو رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں اور یا اعتراف گناہ
کرکے قصور معاف کرا لیتے ہیں۔

خیر ڈلی کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ اس کے تمام دانے سانچے میں ڈھلے
ہوئے ہوں اور ہیروں کی طرح ترشے ہوئے۔ اگر ان کو کبوتروں کے سامنے
ڈال دیا جائے تو وہ بے اختیار ان پر جھپٹ پڑیں۔ ورنہ بدصورت ڈلی کے
بدقوام اور نامکمل ٹکڑے سڑکوں کے کنارے کنکر توڑنے والے مزدور بہت
ہوشیاری سے توڑ سکتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ جو لوگ عمر بھر پان کھاتے ہیں

مگر پان بنانا نہیں جانتے اُن میں یقیناً شئے لطیف کی کمی ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو انگھنو میں رہ کر بھی نسخہ کو نخسہ کہے اور مزاج کو مجاز۔

عموماً پان پیش کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پاندان یا کشتی مہمان کے سامنے اس طرح پیش کر دینا کہ وہ دست خود، دہان خود کے اصول پر خود ہی ڈلی کترے خود ہی پان کے رگ و ریشہ صاف کرے اور خود ہی کتھے چونے کی آمیزش کرے۔ وہی حیثیت رکھتا ہے جس طرح دستر خوان پر بریانی کے پلیٹ رکھنے کے بجائے چاول، گوشت، گھی اور گرم مصالحہ علیحدہ علیحدہ رکھ دیا جائے اور فرمائش کی جائے کہ حسب مرضی خود ہی پکا بھی لے۔ یقیناً پان کے ذائقہ کا معیار جداگانہ ہے۔ اسی طرح غذا کے ذائقہ کا معیار بھی جداگانہ ہے۔ یہ امر میزبان کی صلاحیت اور ادر لیاقت پر مبنی ہے کہ وہ کھانے میں نمک تیز کر دے اور پان میں چونہ۔

دوسرا طریقہ بنے ہوئے پان پیش کرنے کا ہے اس کے مختلف انداز ہیں جن کی صورتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

اوّل، کتر۔ اس کو غریب محبت سے پیش کرتا ہے اور امیر حقارت سے اس لئے پہلی صورت میں شکریہ کے ساتھ قبول کر لینا چاہیئے اور دوسری صورت میں قطعی انکار۔

دوئم۔ دوہرا، پان کو موڑ کر ڈلی، تمباکو اور الائچی علیحدہ علیحدہ رکھ دی جاتی ہے۔

یہ صورت بھی مجھ کو ناپسند ہے۔ کیونکہ یہ پیش کرنے کا ایک بھونڈا انداز ہے۔ جس میں آرٹ کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی مثال یہی سمجھ لیجئے کہ سالن عمدہ پکایا جائے لیکن پتیلی میں نمک ڈالنے کے بجائے دسترخوان پر لاکر رکھ دیا جائے۔ اصول تو درست ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔

سوئم۔ گلوری۔ اس میں ڈلی اور الائچی ڈال کر اس طرح ملفوف کیا جاتا ہے کہ اس کی سطح پر کسی قسم کی شکن نہیں آتی۔ یقیناً یہ بہترین صورت ہے اور فن کے لحاظ سے شاہکار رکھتے اور چونے کے میکسچر کی زاید رطوبت کو ڈلی جذب کرلیتی ہے اور اس طرح پان کا ذائقہ بہتر ہو جاتا ہے۔ اس صورت کی تذکیر بیڑا ہے جو تکونی شکل کا ہوتا ہے۔

جس طرح شعر میں آمد اور آورد کے فرق سے انقلاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ پان بنانے کی تحریک اگر بیرونی ہوگی تو اس کا شمار آورد میں ہوگا اس لئے پان کار کے سامنے ہاتھ مت پھیلاؤ۔ اس فرمائش کا وہی حشر ہوتا ہے جو مصرعہ طرح کا۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس کے پان اور مشاعرہ کی غزلیں اکثر پھیکی ہوتی ہیں۔

(ساقی)

مغالطہ

ظاہراطور سے یہ سوال کہ "ہم سینما کیوں جاتے ہیں؟" کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس صورت میں جبکہ اس کا ایک سے زیادہ جواب ممکن ہو سکے یہ بھی ایک دلچسپ مبحث بن سکتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ فلسفہ کے ہر مبحث کی طرح اس مسئلہ کے بھی دو پہلو ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ مگر ستم ظریفی تو دیکھئے کہ تمام مسلّمہ اصولوں کے برخلاف اس کے روشن پہلو پر تاریک پہلو کو ترجیح دیجاتی ہے۔ اگر آپ کو اس کلیّہ سے اتفاق نہیں ہے تو اولین فرصت ہیں جاکر روشنی میں سینما دیکھنے کی مسلسل مشق شروع کر دیجئے۔ لیکن میرے ایک دوست ہیں جو چند خاص اصولوں کی بناء پر اس کلیت سے قطعی اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا ساون کی گھنگھور گھٹاؤں اور سینما کی اندھیری دھنوں میں دم گھبراتا ہے۔ ان کو بجلی کی کڑک دمک اور اسکرین کی آب وتاب سے آشوب چشم کی شکایت ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اسی لئے وہ وقفہ کے چند لمحوں کو چاندنی رات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس حد تک کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ چاندنی رات کا آسمان پھیکا ہوتا ہے۔ اور

بے رنگ ، مگر یہاں کا آسمان شوخ اور رنگ برنگ۔ یہی وجہ ہے کہ سینما کو حسن کی نمائش گاہ خیال کرتے ہیں فلم کی نہیں۔

ہمارے نقطۂ نظر سے سینما کی مخصوص فضا میں ہر تماشائی غیر ارادی طور سے ایک فطری اداکار نظر آتا ہے اور اسکرین کی مقناطیسی شخصیتوں کے زیر اثر حزنیہ اور طربیہ پلاٹ پیش کرتا ہے۔ چونکہ اصل کو نقل پر ترجیح دینا کوئی گناہ نہیں اسی لئے ہمارا دائرۂ تفریح فلم اور حسن کی قید و بند سے آزاد رہتا ہے۔ اکثر اوقات یہ ہنگامی پلاٹ اس قدر مکمل اور مسلسل ہوتا ہے۔ کہ اس کی ہر ایک کڑی گذشتہ سے پیوستہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تماشہ کے اختتام پر ہمارے دماغ میں ایک جیتا جاگتا فلم اتر آتا ہے۔

کل ہی کا واقعہ ہے کہ ایشیا کے بہترین سینما ریگل بمبئی میں اسکرین کے دو ممتاز مسخروں لارل دھارڈی کی فلم کا مظاہرہ تھا۔ جس کو دیکھنے کیلئے تماشائیو کا ایک ہجوم تھا۔ اور اسی میں برقع پوش خواتین کی ایک نصف درجن تعداد بھی شامل تھی۔ جن کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک چہرہ نقاب کی بست وکشاد سے آزاد تھا۔

پردہ دار عورتوں کیلئے برقع اور کمزور آنکھوں کے لئے عینک "حفاظت کی ٹٹی" ضرور ہیں۔ بشرطیکہ اول الذکر میں نقاب ہو اور آخر الذکر میں تال، وگرنہ برقع کا محض گھیرا اور عینک کی محض کمانیاں صرف اسی قابل رہ جاتی ہیں۔ کہ

ایک کے تکئے کے غلاف بنا لیئے جائیں اور دوسرے کو بچوں کا آلہ تفریح۔ یہی وجہ تھی کہ یہ عجیب الخلقت مخلوق عجائب خانوں کے سنگین بتوں کی طرح رنگیل کی آبادی کے لیئے "نمائش پر" تھی۔

اسی ضمن میں میری نظر ایک مخبوط الحواس نوجوان پر پڑی جو ٹکٹ کی کھڑکی سے نکلا چلا آرہا تھا۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ میرا ہم وطن اور ہم جماعت دوست مسعود تھا۔ میں فرط مسرت میں "ہلو" کہہ کر اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ وہ میری طرف سے رخ پھیر کر اس طرح کترا کر نکل گیا کہ جیسے مہاجن کے سامنے سے قرضدار۔ مجھ کو اس کے اس طرز عمل پر بیحد حیرت ہوئی لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ صرف تنہا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ہمراہی میں مذکرہ برقع پوش خواتین کا ایک رسالہ بھی ہے۔ تو میں نے اس کو دل سے معاف کر دیا۔ اور اس کی سلامتی کیلیئے خداوند کریم سے دعائیں مانگنے لگا۔ کیونکہ دوستوں سے شان استغنا برتنے کے تین ہی موقع ہوتے ہیں جو حق بجانب ہیں اور واجب التسلیم۔ اول برقع پوش خواتین کے ساتھ دوسرے موٹر کے اوپر اور تیسرے پولیس کی حراست میں۔

میں مسعود اور اس کے تمام خاندان سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھکو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے یہاں کی عورتیں عمر میں دو ہی مرتبہ گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالتی ہیں، ایک شادی اور دوسرے موت کے بعد۔ اکثر اوقات جبکہ

شادی ایک ہی گھر میں قرار پا جائے اور قبر کا مکان ہی میں انتظام ہو جائے
تو باہر نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بیماری کے موقعوں پر
بصورت مجبوری اگر ڈاکٹر کو نبض دکھانا ضروری ہوتی تھی۔ تو مریضہ اپنے
ہاتھوں کو ربڑ کے موٹے دستانوں سے محفوظ کر لیتی تھی۔ یہی گذشتہ تاریخ تھی کہ
جس کی روشنی میں مجھے اس کے یہاں کی خواتین کا رنگل سینما میں بے پراگندہ
نقاب نظر آنا ایک انقلاب عظیم معلوم ہوا۔



ہال پُر ہونے کے قریب تھا اور تماشہ شروع ہونے والا تھا۔ کہ اسی اثنا میں
وہی جلوس اس طرح داخل ہوا کہ ہمارے نوجوان دوست سب سے آگے آگے
تھے۔ اور ان کی ہمراہی میں خواتین سنگل فائل میں پیچھے پیچھے۔ ابھی یہ ٹرین
پلیٹ فارم میں پوری طرح داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے ایک ہوشیار
ڈرائیور کی طرح جو لائن کلیر کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھاتا۔ رک کر تمام ہال پر ایک
سرسری نگاہ ڈالی۔ میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہوں
کہ انھوں نے اپنی عمر میں اس سے قبل کبھی اتنا پاکیزہ اور عظیم الشان مجمع نہیں دیکھا
تھا۔ اسی لئے ان کی پیشانی پر پسینہ کے بڑے بڑے قطرات نمودار ہو گئے
وہ یہ فیصلہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی جمعیت کثیر کے لئے کون سی جگہ مناسب
ہوگی کہ پشت پر سے اندر داخل ہونے والوں کا ایک سیلاب آیا جس سے

ان کے جلوس کے تمام افراد میں ایک ابتری پھیل گئی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ قافلہ آگے بڑھا اور قریب کی چند کرسیوں پر جو خالی پڑی ہوئی تھیں اطمینان کا سانس لیکر قابض ہو گیا۔ لیکن قبضہ مخالفانہ تھا کیونکہ انھوں نے عالم اضطراب میں کرسیوں کے رومال بند ہتھوں پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد ایک پارسی خاندان اس سین پر نمودار ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گروہوں کے ذمہ دار لیڈروں میں ایک پر لطف مکالمہ شروع ہو گیا جس میں حاضرین جلسہ نے خاموشی اور سکوت ہی سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ آخر کار سینما کے مینجر کو طلب کیا گیا۔ جس نے گذشتہ روایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ ہمارے بدقسمت دوست کے خلاف سُنا دیا۔

اب ہمارے نوجوان مسافر کے لئے صرف ایک ہی راہ تھی کہ کرسیوں کی اس قطار پر جو سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے درمیان حد فاصل کا کام کر رہی تھی اور ہماری سیٹ سے دوسرے ہی نمبر پر تھی قہر درویش برجان درویش جا کر بیٹھ جائیں آخر کار یہ قافلہ ان خالی کرسیوں کی طرف اس طرح آ رہا تھا کہ تمام حاضرین کی، نگاہیں اس عجیب وغریب جلوس کی طرف تھیں۔ گویا الف لیلیٰ کی کہانی کا کوئی عربی سین دکھایا جا رہا تھا۔

برقعوں کے گھیر کی کشاکش، کرسیوں کے درمیان کی تنگ وسعت اور موجودہ سین کی نزاکت کی وجہ سے سب کے سب مرتعش تو تھے ہی۔ لہٰذا زمین بوسی کے

کے چند حادثات کے بعد یہ لوگ اپنی منزل مقصود پر سلامتی سے پہونچ گئے۔ مگر آفتیں تنہا نہیں آتیں۔ اب اس عقل کو کیا کیا جائے کہ کرسیوں پر بیٹھ تو گئے لیکن اس طرح پر کہ قطار کے دونوں سرے خالی چھوڑ دیئے۔

سینما کی خالی کرسی ایک قسم کی (Vacancy) اسامی ہوتی ہے جس کی خانہ پری جلد یا بدیر ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف کی دو خالی کرسیوں پر دو تازہ دم گورا شاہی جوان آکر جم گئے۔ بدقسمتی سے ہمارے متذکرہ گروہ کی نازک کڑیوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی تھی۔ اس لئے گوروں کے قرب سے خائف ہو کر خاتون نمبر۱ نے خاتون نمبر۲ کے کان میں اس حادثہ کی اطلاع دی جنھوں نے خاتون نمبر۳ سے اس واقعہ کو دہرایا۔ انھوں نے خاتون نمبر۴ سے کنکشن جوڑ کر اپنے فرض کو ادا کیا۔ غرضکہ اسی طرح درجہ بدرجہ یہ برقیہ آخری سٹیشن تک پہونچ گیا۔ وہاں سے چند خاص احکامات صادر کئے گئے جو اسی ترتیب کے ماتحت خاتون نمبر۱ تک پہونچا دیئے گئے۔ نتیجہ اس طرح رونما ہوا کہ خاتون نمبر۱ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے اس عمل پر تمام قافلہ نے ترتیب وار ایضاً کیا اور بہماری بدقسمتی کہ یہ لوگ اسکرین کے ایک دلچسپ سین پر اس طرح نظر آنے لگے جس طرح، مصوّر دیوان غالب کے ایک نفیس صفحے پر گاڑھی گاڑھی روشنائی کے بدنما داغ۔ بیتاب تماشائیوں کو بھلا تاب کہاں۔ انھوں نے "بیٹھ جاؤ" کے نعروں سے تمام ہال کو اپنے سر پر اٹھا لیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ لوگ سینما کے حدود سے باہر ہی جا کر دم لینگے لیکن انھوں نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کیا اور گوری پلٹن کے خطرناک مورچے سے ایک کرسی کا فاصلہ چھوڑ کر دوبارہ مرتب ہو کر بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں ایک نووارد اس خالی جگہ کو دیکھ کر جھپٹا ہی تھا کہ ہمارے دوست نے پیش قدمی کرکے اُس کو اپنے لئے محفوظ کر لیا لیکن صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس شطرنج کی بساط کے لئے دو شاہوں کی ضرورت تھی۔ ایک ہی آدمی دو کمزور کونوں کی حفاظت کس طرح کر سکتا تھا۔؟

سینما کی اندھیری فضا میں میں نے محسوس کیا کہ دوسری طرف کی کرسیوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس طرف بھی وہی صورت نمودار ہو گئی جو اس طرف ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے کان میں خاتون نمبر ۲ کی ایک ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی۔ لیکن وہ تماشائیوں کے قہقہوں کی گونج میں مل کر کھو گئی ورنہ یا تو فائر بریگیڈ کو تکلیف ہوتی یا پولیس کے ایک دستہ کو بہر حال اس مخصوص گروہ میں از سر نو تلاطم ہوا۔ زلزلے آئے اور خبروں کا تبادلہ ہوا یہاں تک کہ ہمارا بہادر ہیرو جائے واردات پر پہنچا اور تھوڑی سی سرگوشی کرنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر واپس آیا لیکن اس طرح کہ کسی پہلو قرار ہی نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی گردن کو پیچھے موڑا۔ میں نے سُنا کہ اُس نے میرا نام لے کر پکارا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی بے بسی پر

گلوگیر ہوا۔ اس موقع پر مجھکو اپنے دوست کی تیز نظری کی داد دینا پڑی۔ کیونکہ جس شخص نے مجھکو بجلی کی طاقتور روشنی میں نہ پہچانا وہی مجھکو اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں دیکھ رہا ہے۔

میں نے ان کی مصیبت کو گوش دل سے سُنا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ محترمہ جو سب سے آخری سرے پر بیٹھی ہوئی تھیں ان کی قریب کی نشستوں پر کئی فرنگی آکر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ٹہلنے سے ان کے شانے کو اس طرح خطرناک طریقے پر ٹھوکا دیا کہ ان کو اختلاج قلب شروع ہو گیا۔ لیکن وہ اس قدر کمزور دل کی نہیں ہیں اس لئے انھوں نے محض صبر سے کام لیا۔ اور صرف ایک ہلکی سی چیخ پر اکتفا کی۔ ورنہ کوئی دوسری خاتون ہوتی تو وہ یقیناً بیہوش ہو جاتی میں سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ سن کر میری رگ حمیت پھڑکنے لگی۔ مگر میں نے موقع کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایسا سینما دیکھنے سے باز آئیں جس میں جان اور آبرو دونوں کا خطرہ ہو۔ اور نہ صرف آج بلکہ عمر بھر کیلئے ان کو توبہ کر لینی چاہئے کہ وہ ایسے بہادر ساتھیوں کو لے کر کم از کم تفریح کے خیال سے اپنے مکان کی چوکھٹ کے باہر بھی قدم نہ رکھیں۔ لیکن اُنھوں نے میرے اس نیک مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور مجھکو مجبور کیا کہ میں نسوانی عزت و وقار اور ہندوستانی عصمت و پاکیزگی کو برقرار رکھنے کیلئے اس حادثہ کی اطلاع سینما کے منیجر کو دیدوں تاکہ اس سفید موالی کو فوراً باہر نکال دیا جائے۔ میں نے

معاملہ کو رفع دفع کرنے کی خاطر دوبارہ ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اس مخصوص جگہ پر کسی بزرگ خاتون کو بٹھا دیجئے یا آپ خود جا کر بیٹھ جائیے۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ بحیثیت ماں ہونے کے سب سے زیادہ بزرگ وہی خاتون ہیں۔ آخر میں انھوں نے میری پست ہمتی پر ملامت کرتے ہوئے کہا۔ کہ اگر اس موقع پر میری خود عزت کا سوال ہوتا تو میں کیا کرتا؟ میں بھی جوش میں آگیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چند ہی قدم بڑھا ہونگا کہ اس واقعہ کی اطلاع منیجر کو دوں۔ لیکن اتفاق وقت دیکھئے کہ فلم کا سلسلہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہال میں یکبارگی روشنی ہوگئی، اس وقت مجھے اپنی اور اپنے دوست کی بیوقوفی پر دل کھول کر ہنسی آئی۔ کیونکہ ان کے والدہ کے قریب کوئی مرد نہ تھا بلکہ چند مہذب لیڈیاں تھیں جن کے سر کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اور وہ فراک کے بجائے سوٹ کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔

(ساقی)

گھونگھٹ کی آڑ

۱

آخر کوئی کہاں تک انتظار کرے۔ ہندوستان کی فضا ایسی ہے کہ جب تک بی۔ اے کی ڈگری نہیں مل جاتی اس وقت تک شادی کا پاسپورٹ بھی نہیں ملتا۔ آخر ہم بی۔ اے پاس ہونے والے تھے اور بقول ہماری نانا کلچمن کے بہت قابل بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اب بھی ہمارے سہرے کے پھول نہ کھلے۔ ہم اپنے والدین کے حق میں دعائیں مانگا کرتے تھے۔ کہ بارالٰہا تو ان کے دل میں ایسی ڈال کہ وہ لوگ بےچین ہو کر ہمارے گھر کے بسانے کی فکر کریں مگر وہ لوگ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے۔ شاید نوکری کا انتظار تھا۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ دوستوں کو بھی اسی زمانے میں شادیاں کر کر کے ہم کو چڑھانا منظور تھا۔ ہم سب کی دعوتیں کھا آتے تھے۔ مگر افسوس کہ ابھی تک ہم کسی کو نہ دے سکے وہ لوگ اپنی اپنی بیویوں کے جہیز دکھا کر ان کی تعلیم و تربیت اور صورت کے قصے سُنا کر اور اپنی پر لطف زندگی کے حال کہہ کہہ کر ہم پر اور بھی ستم ڈھاتے تھے۔ ہمارے سامنے ہی ان کے چھوٹے چھوٹے سالے اور سالیاں اندر سے

آکر اُن کو دولہہ بھائی کہہ کر پکارتے تھے اور پان میں تنکر ڈال کر اپنے محبت آمیز مذاق کو پورا کرتے تھے تو ہمارے دل میں برچھیاں سی لگتی تھیں۔ اور ہم یہ کہتے تھے۔ کہ کاش ہم کچھ اور ہوتے مگر ہندوستانی مسلمان نہ ہوتے تاکہ اس ملک کی خود ساختہ جکڑ بندیوں سے بالکل آزاد ہو کر دولہہ بھائی کہنے والوں کو بھیا ہی کر لیتے۔

گھر میں تو یہ حال تھا مگر ہم باہر جس طرف جاتے تھے اس طرف یہی تذکرہ سنتے تھے۔ وہ لوگ ہم پر اس طرح زور دیتے تھے جس طرح کسی ایسی کنواری لڑکی کے لئے کہا جاتا ہے جس کی عمر دوشیزگی ختم ہو رہی ہو۔ ایک روز ہماری والدہ کی خالہ زاد بہن فرمانے لگیں "بیٹا کب تک پڑھتا رہے گا۔ ابھی جی نہیں بھرا۔ یہی عمر شادی بیاہ کی ہوتی ہے۔"

"اماں کو اختیار ہے۔" ہم نے شرما کر کہدیا۔ گویا ہم ایک ہندوستانی خاتون تھے۔ ہم دل سے تو یہی چاہتے تھے کہ وہ اس مضمون کو اور زیادہ چھیڑیں۔ اور گھنٹوں اسی پر گفتگو کرتی رہیں اور ہم صرف ہاں ہاں کرتے سنتے جائیں اور دل ہی دل میں اس تذکرۂ لطیف سے لطف اٹھاتے رہیں۔ مگر انھوں نے ان دو جملوں کے بعد اس طرح چپ سادھی کہ جس طرح کوئی چالاک میزبان ایک ناخواندہ مہمان کی کھلانے پر صلاح سمرقندی کرے۔ اور پھر اس کے رسمی انکار پر خلاف امید چپ ہو کر کھانے میں مشغول ہو جائے۔ آخر جب ہم انتظار کی تکلیف سے تھک گئے تو ہم نے اس خیال سے کہ اگر ہمارا ذکر نہ سہی تو دوسرے ہی کا سہی کہدیا۔

"آپ ہاشم بھائی کی شادی کیوں نہیں کرتیں"؟

اتنا سننا تھا کہ وہ برس پڑیں "اے بیٹا آج کل کے لڑکے کسی کی سنتے ہیں، پڑھنے کے پیچھے ایسے دیوانے رہتے ہیں کہ وہی کتابیں ہی بس ان کا سب کچھ ہو جاتی ہیں۔ خدا خدا کر کے پڑھ لئے تو اب نوکری کی فکر ہوتی ہے۔ یہی ان کا بھی حال ہے۔ کہتے ہیں کہ جبتک کم از کم تین سو روپیہ ماہوار نہ ہوں ہیں شادی ہی نہ کرونگا۔ انھیں اس کی فکر ہے اور مجھے دن رات یہی سوچ لگی ہے کہ ہے اللہ کا دیا خدا عمر دراز کرے ایک ہی بچہ ہے۔ اگر اس کی بھی نسل منقطع ہو گئی تو ہمارے نام کا کوئی فاتحہ دلانے والا بھی نہ رہے گا۔"

ہم نے اس موقع کو غنیمت جان کر انھیں اور بھی اکسانا شروع کیا "جی ہاں! میں نے سائنس میں بھی پڑھا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں کہ بیس سال کی عمر کے بعد تو شادی ضرور ہی کر لینا چاہیئے ورنہ ......"

"ہاں! انھوں نے گھبرا کر کہا۔" ایسا ہے" میں ان کی پریشانی کو دیکھ کر دل میں خوب ہنسا۔ "اے بیٹا! تیرا تو وہ دوست بھی ہے۔ بھائی بھی ہے۔ ذرا راضی کر لے۔" وہ گڑگڑا کر کہنے لگیں۔

"میں آپ کے کہنے سے پیشتر کئی مرتبہ اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں" میں نے اس بے ضرر جھوٹ کی آمیزش میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔ "وہ کہتے ہیں کہ جب تم اپنی شادی کرو گے اسی وقت میں بھی کرونگا" میں نے ذرا شرماتے ہوئے کہا" مگر

کسی سے کہئے گا نہیں۔" تاکید بھی کر دی۔

"ہاں! اچھا تو رہے گا!" خالہ نے فرطِ مسرت سے اُچھل کر کہا۔ "میں تمھاری ماں سے کہونگی اور ان پر زور ڈالوں گی۔ سچ تو ہے کیا لڑکے خود ڈھونڈ لائیں۔ آ ہے کیا اچھا رہیگا کہ دونوں کی شادی ایک ہی ساتھ ہو۔" جب میں وہاں سے اٹھا ہوں تو دل فرطِ مسرت سے رقص کر رہا تھا۔



دس پانچ عورتیں ایک جگہ بیٹھ کر شادی کے معاملے کو اس قدر جلد حل کر دیتی ہیں کہ لندن میں وہائٹ وال والے بھی ایسی سلطنت کے جس میں سورج کبھی ڈوبتا ہی نہیں پیچیدہ مسائل اس قدر جلد نہیں حل کر سکتے۔ جس طرح کوئی انٹرنس پاس ممکن نوکریوں کی ایک مکمل فہرست بنا کر عرضیوں کے پلندوں کی تیاری کرتا ہے۔ اسی طرح قابلِ شادی لڑکیوں کی زبانی فہرست تیار کی گئی۔ اس پر شدید بحث و مباحثہ ہوا اور بعد نکتہ چینی کے بعد جس میں ممبرانِ عمومی نے طعن و تشنیع کے "ملکے" بھی استعمال کئے اور اپنے اپنے رزلیوشنوں کی تعریف میں معجز بیان دھواں دھار تقاریر سے زمین اور آسمان کے قلابے بھی ملائے گئے۔ یہاں تک کہ ووٹ اور کثرتِ آرا کے معاملے کو بالائے طاق رکھ کر جمہوریت کے بنیادی اصول کو پس پشت ڈال کر مسئلہ انتخاب کو میر مجلس (خالہ اماں) کے فہم و فراست کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

انھوں نے چند کو چن لیا اور چند کو کچھ نہ کچھ عیب نکال کر خارج از بحث کر دیا۔ اس غیر دستوری کونسل کے خود ساختہ صدر اور چیدہ کمیٹی کے زباں دراز ارکان نے ایک بے ضابطہ اختیار حاصل کیا۔ جس کی رو سے انھیں اس بات کا حق حاصل ہو گیا کہ وہ طاقتہائے مذکورہ کی حدود میں داخل ہو کر ان کی اخلاقی۔ اقتصادی۔ مالی اور تعلیمی حالت کی تفتیش کریں اور جلد از جلد اپنی رپورٹ جلسہ عمومی میں پیش کر کے اس بات کا موقع دیں کہ ان میں سے ایک پر سب متحد الخیال ہو جائیں۔ تاکہ فوراً اس منتخب قلمرو کے ڈکٹیٹر اور کارفرما سے اس اہم عہد نامہ کی تکمیل کے لئے گفت و شنید کریں جس کی رو سے ہم کو کچھ خاص مراعات کے ساتھ حقوق تجارت حاصل ہو جائیں۔ مگر ہم چونکہ حضور والسرائے بہادر کی طرح دی۔ ٹو (خود اختیاری) کا پروانہ بی۔ اے کی ڈگری کے ساتھ ہی حاصل کر چکے تھے اس لئے ہمیں حق تھا کہ ہوم گورنمنٹ سے جس قدر بھی بل پاس ہوں۔ ان پر کڑی نکتہ چینی کر کے خارج کر دیں اور ہم وہی کریں جو ہمارے دل میں ہو ہم نے بھی اس قوت کا استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شورشیں ہوئیں مظاہرے ہوئے۔ مگر آخر کار شکست در پردہ سرپرستی ماننا ہی پڑی۔ ہم نے ان میں سے ایک بل کو اجازت دی کہ وہی ایجنڈا میں رکھا جائے۔ اور اس کے بعد تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کوشش بھی کی کہ پاس بھی وہی ہو جائے۔۔۔

۳

بیاہ اور نوکری دونوں غلامی کے مختلف نام ہیں۔ اول الذکر بیوی اور سسرال کی اور آخرالذکر گورنمنٹ کی۔ دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو دونوں شادیاں ہیں اور دونوں میں داماد بننا پڑتا ہے۔ خواہ خسر کا خواہ سرکار کا۔ دونوں کا حصول بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ نوکری کے لیے عرضی دینا۔ سرٹیفکیٹ پیش کرنا۔ سفارشات لانا۔ حکام بالا سے ملاقات کرنا۔ انتخابی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا۔ طبی معاینہ کرانا۔ اور مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنا۔ بالکل وہی درجے ہیں جو ایک دوا کو کیمیا گر کے ہاتھوں اکسیر بننے تک پیش آتے ہیں۔ فی زمانا مقابلہ کے امتحان میں پاس ہونا بھی ایک آنچ کی کسر کے مسلم الثبوت اصول کو غلط ثابت کرنا ہے۔ ان تمام مرحلوں کے بعد جس طرح مدبر رانگہ کے کشتے کو اصلی مزاج پر لانے کیلئے ایک عرصۂ دراز تک زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یا جو کے ڈھیر میں داب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کشتۂ ملازمت کو بھی تقرر حاصل کرنے کے لئے امیدواری کے قعر گمنامی میں ایک لامحدود زمانہ تک ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ عمر کے باقی حصے میں اگر بیوی کو طلاق دینا اور نوکری سے خلع لینا منظور نہیں ہے تو دونوں کے حصول کے لئے یہ تمام کڑیاں جھیلنا ہی پڑینگی۔ ورنہ دونوں طرف سے عمر بھر جھینکنا اور چھینکنا تو ہے ہی۔

ہم کو چونکہ گورنمنٹ اور اپنے خسر دونوں کا بیک وقت داماد بننا تھا،

اس لئے سرکار کے یہاں جتنی بھی قابل نکاح اسامیاں تھیں ان سب کے لئے ایک ساتھ نسبتیں بھیجدیں تاکہ کہیں ایک نہ ایک کے لئے تو انتخاب ضرور ہی ہو جائے۔ اسی اصول پر ہم بڑی سے بڑی نوکری آئی۔سی۔ایس، اس کے بعد پی۔سی۔ایس اس کے بعد پولیس سروس اس کے بعد تحصیلداری اس کے بعد قانون گوئی اور سیکریٹریٹ کے امیدوار بن کر آج کسی امتحان میں بیٹھے۔ کل کسی کی انتخابی کمیٹی میں پیش ہوئے اور پرسوں کسی کے طبّی معائنے میں بلائے گئے یہاں تک کہ اوپر لکھے ہوئے ان تمام درجوں کو رفتہ رفتہ طے کر کے اب سرکار کی "ہاں" یا "نہیں" کا انتظار کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ہم دوسری دادی کے لئے وہ تمام درجے طے کر چکے۔ جو نسبت کی دینے اور مٹھائی کی رسم انتخاب تک ایک ہونے والے دولہا کو پیش آتی ہیں۔ بر دکھوا جانے میں ہمیں وہی دقتیں ہوئیں جو گورنمنٹ کی انتخابی کمیٹی کے سامنے پیش آئی تھیں۔

جب ہوم میرج کمیشن، بروزن پبلک سروس کمیشن کے نسوانی ارکان نے ہماری لاعلمی میں چلمن کی نازک تیلیوں کے درمیان سے ہمارے کلا صوفا تعلمون چہرے کو جس پر آئی۔ سلما کریم کی تقریباً ایک انچہ پالش کی گئی تھی اور پامپیا ویسلین سے بالوں کو فینسی قواعد کرائی گئی تھی۔ ہر ممکن زاویہ نگاہ سے ایک سائنسداں ترازو باز کی طرح جانچ پڑتال لی۔ اور ہماری ہونے والی

سسرال کے عقبس ذکورنے سی۔آئی۔ڈی کی طرح ہمارے شجرۂ نسب چال چلن اور خاندانی کیفیات سے کماحقہ آگاہی حاصل کرلی۔ اور ہم نے ان تمام مقابلہ کرنے والے دولھاؤں پر جن میں ہمارے یک جان دو قالب گریجویٹ دوست بھی تھے۔ اپنی فوقیت ثابت کردی ——— اس وقت ہم نے اطمینانی سانس لی۔

خدا کا فضل جب شامل حال ہوتا ہے تو بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ ہم آئی سی ایس۔ پی سی ایس۔ پولیس سروس وغیرہ میں ناکام رہے۔ اس لئے کہ ہم اپنے نازک دماغ کو جبکہ مہاتما گاندھی کی ہنگامہ آرائیاں ہورہی تھیں۔ ایک ذمہ دار آفیسر بن کر پبلک کے اوپر بندوق کی نشانہ بازی کی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ مگر سیکریٹریٹ کے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوگئے جس ہم ہندوستانیوں کی آبائی خدمت "جی ہاں" کو اچھی طرح انجام دیسکتے تھے پھر دولوں بیٹھے۔ آخر کار ایک شدید انتظار کے بعد اس طرف سے بھی سسرال کی مانگ آئی اور اب ہم خدا کا شکر کہ نوکری بہادر اور بیوی بہادر کے ڈبل خطاب کے مستحق ہوچکے تھے۔

۴

"من درخیال ایم و گورنمنٹ درخیال"۔ جس زمانہ میں ہماری بات چیت چل رہی تھی۔ اسی زمانہ میں سارداصاحب نے اسمبلی میں اپنا بل پاس

کرا کے ہندوستان کی سرزمین پر قریب البلوغ لڑکے اور لڑکیوں پر بڑا ستم کیا۔ ہم چاہتے تھے کہ اس قانون کے نفاذ سے پہلے ہی ہماری منگنی، نکاح، اور رخصتی کی تمام رسمیں معرض ظہور میں آجائیں۔ مگر چونکہ ہم لوگوں کے یہاں کی جانے والی شادی کے لیئے اتنا ہی سامان مصالحہ اور اسباب فراہم کرنا ہوتا ہے، جتنا کہ گذشتہ جنگ عظیم کیلئے قیصر ولیم کو ایک ربع صدی کی مدت میں کرنا پڑا تھا۔ اس لیئے ہماری خواہش کا پورا کرنا گویا ہتھیلی پر سرسوں جمانا تھا۔ ہم نے اپنے ان بے تکلف دوست کو جن کی بہنوں کے لیئے صحیفہ نسوانی میں "کان پیارے تو بالیاں اور بیوی پیاری تو سالیاں"۔ کی آیت موجود ہے۔ یہ ستانی سنائی۔ بڑی سر مغزنی کرنے کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آئی تو وہ بھی گھبرا گئے کیونکہ تقریب نکاح کی تاریخ سارڈا بل پاس ہونے کے صرف دو ہی ماہ بعد تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ اس نئے قانون کے لحاظ سے پورے ایک سال ایک ماہ اور تین ماہ بعد ہی بیاہی جا سکتی تھیں۔ واقعی بڑا ظلم تھا۔ گورنمنٹ کو کم از کم ان لڑکیوں کا خیال ضرور رکھنا چاہئے تھا۔ جو زیادتی خون کی وجہ سے اپنی اصلی عمر سے کئی برس بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر خالہ جان کا قول صحیح تھا تو وہ اس قدر جلد بڑھ رہی تھیں کہ جس طرح چڑھتا ہوا چاند بڑھتا ہے، اور اسی لئے اُن کے والدین کو بھی اس قانونی مجبوری سے افسوس ہوا۔ کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ گھٹتے ہوئے چاند کی شکل میں آسمان

عروسی پر جلوہ افگن نہ ہوں۔ بلکہ چہرہ بدرے کر ہی نمودار ہوں۔
انگریزی حساب سے ان کی عمر تو کم تھی ہی۔ ہم نے عورتوں کے حساب "میران جی" ایک اور "مدار" دو کے حساب سے دیکھا تب بھی سوائے سوا مہینہ کے فائدے کے اور کچھ ہاتھ ہی نہ آیا۔ اس لئے سعدی علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق۔ "اگر خواہی سلامت بر کنار است" کے زرّیں اصول پر چل کر تہہ درویش بر جان درویش خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ نمک کے قانون کی طرح ہم بھی اس قانون کو توڑ ڈالیں اور جیل یا جرمانہ کے بعد بیک وقت عروسی اور لیڈری دونوں کے ہار پہنیں مگر "عشق تو کرتے مگر گھر کام ہے" میں ترمیم کر کے "جیل تو جاتے مگر گھر کام ہے"۔ دل ہی دل میں کڑھتے رہے اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔



"اور کیسی پڑی مرے اللہ نئی"۔ ہمارے ہی زمانے میں گاندھی جی کو ہندوستان آزاد کرانے کی فکر ہوئی۔ ہمارے ہی وقت میں دنیا بھر کی تجارت میں کساد بازاری ہوئی اور ہمارے ہی لئے ہندوستانی گورنمنٹ کی قارونی جیب خالی ہو گئی اور ہمارے ہی موقع پر سارد ابل پاس ہوا گویا ہندوستان کی آب و ہوا اس زمانہ میں کچھ اور ہو گئی تھی۔ اور رامائن کے زمانے میں بھی خرد سال لڑکے اور لڑکیوں کی شادی سے بہت بڑا نقصان ہوتا تھا۔ ادھر سارداجی کے ہاتھوں شادی کی

لمبی چوڑی تقریب سکڑ کر منگنی رہ گئی۔ اور ادھر گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے سبب سکریٹریٹ کی ملازمت امیدواری میں تبدیل ہوگئی۔ وہاں ایک سال تین ماہ تین دن کی کسر تھی اور یہاں جگہ خالی ہونے کے انتظار کی کھینچ تھی جس کی مدت بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ یا اس سے بھی زیادہ۔ خیر اگر دونوں طرف سے الفظ نہیں ہوئی تھی مگر ایک زمانہ کیلئے چھٹی ضرور مل گئی تھی۔ ہم نے کہا چلو اچھا ہی ہوا جب سے ہوش سنبھالا اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں ہندوستانی اساتذہ کی نازو ادا کے تختہ مشق بنے رہے جو ہم سے سیدھے منہ بات کرنا۔ اخلاق سے پیش آنا اور ہماری خودداری کو برقرار رکھنا تو کجا، ہم کو دیکھتے ہی ایسی صورت بنا لیتے تھے جیسے پردہ سینما پر کوئی ہندوستانی ایکٹر مجنوں اور فرہاد کا منہ چڑھا رہا ہو۔ ڈگری ملنے کے بعد افسران سرکاری کے پاس کاسۂ گدائی لیئے ہوئے پھرے۔ اب کچھ دنوں کے لیئے تو اطمینان ہو جائیگا۔ سچ مانئے جس طرح گھوڑا اپنی پیٹھ پر کاٹھی کا بوجھ، منہ میں لگام کی زنجیر اور پیر میں جکڑ والی رسی نہ پا کر منہ بچا کر کے بے تحاشہ دوڑنا شروع کرتا ہے اور جو سامنے آتا ہے اس کے دولتیاں رسید کرتا ہے اسی طرح ہم بھی ہر طرف سے آزاد ہو کر اپنے بھانجی، بھانجوں اور بھتیجی بھتیجوں کے سامنے خوب ناچے۔ کودے، اچھلے اور ان بچوں کو ہنسی مذاق میں ہی طمانچے چپت اور کان مروڑی سے رلا رلا دیا۔

دوسرا دور

اسباب ضرورت، ناشتہ، امام ضامنوں کی پوٹ اور بزرگوں کی نصیحت اور تاکید کے طومار ساتھ لے کر ہم چھٹی منانے نکلے اور ہندوستان کے پھاٹک کی طرف پرانی اصطلاح میں چل کھڑے ہوئے اور اس زمانے کے لحاظ سے ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ اب یہ تو ایک مستقل عنوان ہو جائے اگر ہم یہ بیان کرنے لگیں کہ ہم نے وہاں کیا دیکھا۔ لیکن مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ ہمارا سا کالج کی چہار دیواری میں رہنے والا ایک دوشیزہ مثال نوجوان جب اس وسعت میں داخل ہوا تو یکایک آنکھوں پر سے پردے ہٹنے کی وجہ سے خیرگی پیدا ہو گئی۔ اور شیشۂ دل سے محکومیت کا کاگ اچھلنے کی وجہ سے جذبات شوق و اضطراب چھلکنے ہی لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

ہاتھ سے جاتا رہا دل اور گیا دل سے شکیب

مگر "عشق تو کرتے مگر گھر کا مہم ہے" کو مدنظر رکھ کر جولانیٔ طبع کو زیر لگام کرنا ہی پڑا۔ اور صرف "آنکھیں میری باقی ان کا۔ میرا حصہ دور کا جلوہ" پر عمل کرتے ہوئے دائرہ تفریح کو چشمہائے شوق ہی تک محدود کر دیا۔

تفریح و سیر کے ساتھ ساتھ تجربہ اور روپیہ بیک وقت ہاتھ آئے تو کیوں نہ لیا جائے۔ اشیاء درآمد و برآمد کے ایک بڑے آفس میں ہم کو نوکری مل گئی

اور ہم نے ایک سال یہیں گزارنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اور اسی مضمون کا ایک خط بھی مکان پر لکھ دیا۔ حالانکہ ہمارے میکے والے (یہ لفظ مردوں کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے) اور سسرال والے بمبئی جیسے شہر میں جہاں ان کے خیال میں صرف دق اور حضرت آدم کو جنت بدر کرنے والی ہستیوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں ہمارے رہنے کے قطعی خلاف تھے۔ مگر آخر کار ان لوگوں کو بھی ہمارے کانگرسی دلائل پر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

یوں تو تمام وقت گوناگوں مصروفیتوں اور تفریحوں میں گزر جاتا تھا لیکن اس خاص عمر میں اس خاص شہر میں اور خاص ماحول میں ایک صبح سے دوسری صبح ہونے تک ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جس میں سوسائٹی، مطالعہ، موسیقی سیر و تفریح اور نیند جیسی روح نواز مشغلوں سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ گویا یہ ایک قسم کا دورہ ہوتا ہے۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ اس وقت دل کی بے چینی، بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دماغ بہت سبک ہو جاتا ہے اور خیالات تیز رفتاری کی انتہائی منزل تک پہونچ جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دورہ کو کس نام سے تعبیر کیا جائے۔ میں نے اس کی دو قسمیں کی ہیں۔ دورۂ ازدواجی اور دورۂ شاعری، مگر مجھ کو تشخیص سے معلوم ہوا کہ مجھ پر نہ تو اول الذکر تھا اور نہ آخر الذکر، بلکہ میرا مرض دورۂ مضمون نگاری تھا جس کی علامات دورۂ شاعری سے بہت مشابہ ہیں۔

میں ہومیوپیتھی کا قائل ہوں جس میں علاج بالمثل کا اصول استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے میں نے دور مضمون نگاری کا علاج مضمون نگاری ہی سے کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹران علم ادب کی رائے ہے کہ ہندوستان جہاں اور بیماریوں اور بلاؤں کا گھر ہے وہاں شاعری اور مضمون نگاری کے جراثیم کے لئے بھی اس کی فضا بہت موزوں ہے۔ اور یہ مرض فی زمانا بہت ترقی کر گیا ہے۔ مگر میں ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ دراصل یہ مرض "آلو" اور دوسری مہلک بیماریوں کی طرح یورپ سے لایا گیا ہے۔ چھاپے خانوں کی ایجاد سے اس کے جراثیم میں بے حد زیادتی ہو گئی ہے۔ پرانے ہندوستان میں اس مرض کا کوئی، خاص نام بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ اختلاج قلب کی طرح شاہانہ مرض تھا۔ خاص آدمیوں ہی کو ہوا کرتا تھا۔ اور اس کی دوائیں بھی قانون اور دوسرے مخزنوں میں نہیں لکھی جاتی تھیں۔ بلکہ راز سربستہ کی طرح پوشیدہ رکھی جاتی تھیں جن کا علم اکثر و بیشتر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

یہاں تو خیر اس کے مریضوں پر خفیف ہی حملہ ہوتا ہے اور بہت سے اچھے بھی ہو جاتے ہیں لیکن یورپ میں یہ مرض وبا کی شکل میں اب تک موجود ہے۔ کسی زمانے میں اس کے انسداد اور حفظ ماتقدم کی تدابیر وہاں کے ماہران فن بھی سوچتے رہے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار مجبور ہو کر خلقت کو فطرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

اور ہے بھی یہی بہترین ترکیب۔ اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ کو اس مرض سے نقصانات کی بجائے فائدے ہی زیادہ معلوم ہونگے۔ کیونکہ یہ مرض بے انتہا متعدی ہے اور اس کے کیڑے آنکھ اور کان کے ذریعہ جاکر تندرستوں کو بھی مبتلا کر دیتے ہیں۔ اِدہر آپ نے زبانی سنا یا اخباروں میں پڑہا کہ فلاں بھلے چنگے آدمیوں پر بُری طرح اس مرض کا دورہ ہوا ہے اور وہ اپنی عبرتناک حالت سے دوسروں کو بھی محو تماشہ بنائے ہوئے ہیں۔ بس سمجھ لیجئے کہ آپ بھی بیمار ہو جائینگے۔ یا بیمار ہونے کی کوشش کرینگے۔ اگر آج نہ سہی تو کل۔ ہاں تو جب مریضوں کی اس قدر زیادتی ہوتی ہے تو ڈاکٹروں، ہسپتالوں، دوا خانوں اور دوا سازی کے کارخانوں کو کس قدر فائدہ ہونا چاہئیے؟

دو تین سال ہوئے کہ لکھنؤ میں ملیریا پھیلا۔ وہی مچھر پبلک کے خون میں تو ملیریا کے کیڑے چھوڑتے تھے اور ڈاکٹروں کی جیبوں میں چاندی کے سکے اور کاغذ کے نوٹ ڈالا کرتے تھے۔ ادہر جنازے نکلتے تھے۔ گھر برباد ہوتے تھے۔ فاقے مرتے تھے اور اُدہر فاقے مارنے والے نئی نئی عمارتیں اور مطب خانے تیار کرا رہے تھے۔ اسی طرح دورۂ مضمون نگاری کے بیمار بھی اپنا عزیز وقت، مہنگا کاغذ اور ڈاکخانہ کے ٹکٹوں میں گاڑھی کمائی کا روپیہ دے کر ادب کے عطاروں سے نسخے اور دوائیں منگوا کر تجارت اور بازار کی رونق بڑہانے میں کتنی کوشش کر رہے ہیں۔

ہیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیر میں نے مضامین لکھے۔ صحیح اور صاف کر کے کئی کئی نقلیں اتاریں بڑے بڑے لفافوں میں رکھیں اور ایڈیٹروں کو جواب کی زحمت سے بچانے کے لئے جوابی ٹکٹ رکھ کر ہندوستان کے مقتدر پرچوں کے نام روانہ کریں

جس طرح کوئی مالی زمین میں بیج ڈالتا ہے اور صبح سویرے جاکر زمین کو کرید کرید کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح میں بھی ڈاکخانہ کے روزانہ چکر لگایا کرتا تھا۔ اور ڈاکیہ کو اگر وہ راستہ میں مل جاتا تھا سائیکل پر سے اتروا کر یہی سوال کیا کرتا تھا، "کہو میرا کوئی پرچہ ہے؟" جب وہ انکار کیا کرتا تھا تو میں تاکیداً کہا کرتا تھا۔ "ذرا دوبارہ دیکھ لو کہیں کسی خط میں چپک گیا ہو" زمانہ انتظار ہی انتظار میں گذرتا گیا۔ اگر ہمارے مضامین کی کوئی وقعت ہوتی تو جواب بھی آتا اور پرچہ بھی آتا آخر کار ہم نے یقین کر لیا کہ ہم میں مضمون نگاری کی قابلیت ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس لڑکے کی طرح جس نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ فیل ہوا اور چھوڑ دیا۔ اسی طرح مرد مضمون نگاروں کی فہرست سے ہم نے اپنا نام خود خارج کرا لیا۔

اب یہ سوال تھا کہ ہندوستان کے نسوانی رسالوں میں کیا سب مضامین عورتوں ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ ان میں بعض عورتیں خود لکھتی ہیں بعض اصلاح اور مدد لیتی ہیں اور بعض اسی طرح کی مضمون نگار ہوتی ہیں جس قسم کے بہت سے ہز ہائینس مقرر۔ اول الذکر کی شہرت ان کے

بھائیوں اور شوہروں کی منت کش ہے اور آخرالذکر کی کسی گدڑی کے لعل سے
زورِ فکر کی۔ ایسے گھونگھٹ کی آڑ لینے والے مرد یا تو اس دباؤ میں لکھتے ہونگے
کوئی گلے میں ہاتھ ڈال کر اٹھلاتے ہوئے کہتا ہوگا۔ "اللہ دیکھو! بنو آپا کا نام
تو اخباروں میں آنے لگا ہے۔ ہمیں بھی کچھ لکھدو۔" یا وہ خود اپنے دوستوں کے
سامنے فخر جتانے کیلئے ایسا کرتے ہونگے۔ اور جب کہیں کسی ہم صحبت کے
یہاں جاتے ہونگے تو وہ پرچہ بھی ساتھ لیجاتے ہونگے۔

"دیکھئے فانی صاحب کی غزل کتنی زوردار ہے۔ بھئی خوب لکھا ہے"۔

"لائیے لائیے دیکھیں"۔ ان کے دوست دانت نکال کر کہتے ہیں۔

"ٹھہرئیے میں پڑھ کر سناتا ہوں"۔ ورق اس طرح رک رک کر الٹتے ہیں کہ
میرے یار کی نظر پڑ ہی جائے۔ بیگم منم اور مسز منم پر، جہاں نگاہ ٹھہری بس سمجھ لیجئے
مقصد حاصل ہوگیا۔ "ارے تمھاری وائف بھی لکھتی ہیں۔ واللہ آج ہی معلوم ہوا!
لانا، لانا، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔" لیجئے وہ اس مضمون میں منہمک ہوگئے
فانی اور جوش معرض التوا میں رہے۔

ہم نے بیگم منم کے نام سے مضامین اس لئے لکھے کہ اول تو شایع ہونے
میں دقت نہ ہوگی۔ دوسرے عورتوں کے نقطۂ نگاہ سے مضامین بہت مقبول
ہونگے اور تیسرے یہ کہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ، ہم سے شادی ہونے تک کافی
مشہور ہوجائینگی اور اس آسمان سے گری ہوئی شہرت سے بہت خوش ہونگی۔

مضمون لکھنا، دانستہ املے کی غلطیاں کرنا۔ تحریر ذرا بگاڑنا۔ ایڈیٹرس کو ملفوف خط اوئی کی جھونک میں لکھنا ذرا دقت طلب امور تھے۔ خیر سر انجام ہو گئے مگر ایک مرحلہ باقی رہ گیا۔ ہندوستان میں عورتیں تو چونکہ پردار ہیں ہی۔ ان کا نام بھی پردہ دار ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی بیگم کا نام ابھی تک نہیں معلوم تھا لہذا ایک طبعزاد نام جس کے ہر ہر حرف سے خوبصورتی ٹپکتی تھی بیگم منم کے الفاظ پر اس طرح آویزاں کر دیا جس طرح سائن بورڈ پر رات کے وقت بجلی کا بلب۔

نئے مضمون نگار پر رسالہ کا رعب بٹھلانے کے لئے ایڈیٹروں کا عموماً قاعدہ ہے کہ وہ اس کے مضمون کو ایک خاص مدت تک امیدواری کے خانے میں ضرور رکھتے ہیں۔ خواہ اس کا مضمون کتنا ہی نفیس کیوں نہ ہو، اور ان کو اس کی کتنی ہی سخت ضرورت کیوں نہ ہو۔ یہی حشر ہمارے بیگمی مضمون کا بھی ہوا۔ انتظار بہت برا ہوتا ہے ہم تقاضہ کا خط لکھنے بیٹھے۔ مگر آخر میں آکر بیگم منم کا خود ساختہ نام جو بھولے ہیں تو ایسا بھولے کہ باوجود یاد کرنے کے یاد نہ آیا۔ اور یاد آیا تو بالکل غلط، اور اُس کا پتہ ہم کو اس وقت چلا جبکہ ایڈیٹرس کا خط ہمارے نام آیا جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ اس مضمون کو آپ کی کن بیگم سے منسوب کیا جائے ــــــ؟ آیا پہلی سے یا دوسری سے؟

بہر حال مضامین شایع ہونے لگے اور ہماری مفروضہ بیگم اردو ادب میں نام پیدا کرنے لگیں، اُن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے

له میرے پاس میرے بہت سے دوستوں کے خطوط آئے۔ جن میں سے ایک کو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

"......بیگم ابوطاہر کے مضامین بہت مقبول ہوئے ہیں۔ پہلے تو میں یہ خیال کرتا تھا کہ شاید تم خود لکھا کرتے ہو۔ لیکن طرز تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ کسی تعلیم یافتہ خاتون ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے میں تم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد شکایتاً لکھتا ہوں، بُرا نہ ماننا اگر تم مجھ کو شریک نہ کرتے تو کم از کم اطلاع ہی دیدیتے۔ یوں خاموشی سے شادی کر لینا مراسم دوستی کے سخت خلاف ہے، اگر تم اس کو رازہی رکھنا چاہتے تھے تو کیا میں تمھاری نظر میں قابل اعتبار نہ تھا۔

میرے ان خیالات کو تمھارے دوست قمر صاحب کے بیان سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ جن کو تمھاری شادی کا مکمل علم ہے۔ مگر میں یہ نہ سمجھا کہ گھر پر تمھاری شادی طے ہو چکی تھی اور منگنی بھی ہو چکی تھی۔ اس کو تم نے بلا جواب دیئے ہوئے کیوں ایسا قدم اٹھایا بہر حال ع امور مملکت خویش خسرواں دانند۔ خیر میری طرف سے آپ کی مس مہر جہاں (بیگم......) کی خدمت میں جو کم از کم الیف ۔ اے معلوم ہوتی ہیں سلام نیاز تو ضرور کہدنیجئے گا۔ (تمھارا ہاشم حسین)

سچ بتایئے اگر آپ میری پوزیشن میں ہوتے اور ایسا خط موصول ہوتا تو آپ اس زبردست مغالطہ پر کس قدر ہنستے۔ میں نے مضامین کس غرض کے ماتحت لکھے اور یہ لوگ کیا سمجھے؟ ستم ظریفی کی حد ہو گئی۔ میں اس قدر ہنسا کہ پیٹ میں بل پڑ گئے پسلیاں دکھنے لگیں اور آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔

ہنسی ختم ہونے پر میں نے خط پھر اٹھایا اور کئی بار پڑھا۔ ہر مرتبہ نیا لطف ملتا تھا "قمر صاحب کے بیان سے تقویت ہوتی ہے"۔ اب اس جملہ پر میری نظر ٹھہری۔ ہنسی کا بادل ہٹ جانے کے بعد عقل کی روشنی نمودار ہوتی ہے شروع میں میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ قمر صاحب وہی ہیں جو میری منگیتر سے شادی کرنا چاہتے تھے اور شروع میں میرا اور ان کا زبردست مقابلہ رہا تھا۔ مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہ میری اس بے گناہ تفریح کو اصلیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھینگے۔ ابھی میں غور ہی کر رہا تھا اور کسی خاص نتیجہ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ دوسرے ہی روز میری والدہ کا خط بھی آیا جس میں میرے اس مفروضہ فعل قبیح پر نفرت و حقارت کا اظہار کیا گیا تھا جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آپ حضرات کی تفریح کے لیئے اس کو بجنسہ نقل کیئے دیتا ہوں۔

"........ آخر تم نے وہی کیا کہ جس کا مجھکو ڈر تھا۔ وہاں پر تمھارے نوکری کرنے اور رہنے ہی سے میں سمجھ گئی تھی کہ اب تم میرے ہاتھ سے گئے

مجھ کو تو اب بھی نہ معلوم ہوتا اور میں اسی طرح بیوقوف بنی بیٹھی رہتی اگر........ (لڑکی کے والد) خود آکر تمھاری بیگم صاحبہ مہر جہاں کی تصویر اور مضمون نہ دیتے۔ تم نے یہ حرکت کر کے ہم لوگوں کو کہیں کا نہ رکھا، میں تو منہ بھی نہیں دکھا سکتی۔ شریف تو زبان پر جان دیدیتے ہیں مگر تم ایسے ہوئے کہ منگنی کا بھی خیال نہ کیا۔ بھلا منگنی اور شادی میں کیا فرق ہے۔ دو بول ہو کر وہ تمھاری ہو جاتی۔ اولاد کی تمنا لوگ اسی دن کے لئے کرتے ہیں کہ ماں باپ کے ماتھوں پر ایسی ایسی حرکتیں کر کے کلنک کا ٹیکہ لگائیں۔

خیر اس لڑکی کا بھی خدا تھا۔ اس کا بھی عنقریب نکاح ہونے والا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے چند دن اور ٹھہرنے کو کہا تھا تاکہ تمھارے خط سے تفصیلی واقعات معلوم ہو جاتے۔ مگر جب انھوں نے کہا کہ رسالہ میں تصویر کے ہوتے اب کیا شک رہ گیا۔ تو میں بھی خاموش ہو گئی۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ تم جہاں رہو خوش رہو مجھ سے کوئی مطلب نہیں ــــــ"

خط کو ختم کر کے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ دل کے دھڑکنے کی آواز کانوں تک آرہی تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے اور سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ نہ معلوم اس حالت میں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد مجھ پر رونے کا دورہ ہوا

آنسوؤں کے نکل جانے سے جب ذرا دل ہلکا ہوا تو میں نے خیال کرنا شروع کیا کہ مضمون تو میں نے ہی بھیجے تھے۔ یہ تصویر کا کیا معاملہ ہے۔ کیا میری بدقسمتی نے ایسا رنگ لیا۔ یا بیگمی عبارت نے لوٹ پوٹ کر اس تصویر کا مجسمہ اختیار کیا یا ایڈیٹر نے اپنے تخیل کو کام میں لاکر مضمون کی زینت بڑھانے کو ایسی حرکت کی ہے۔ یا قمر صاحب نے چالاکی کی۔ میں نے وہ رسالے پھر نکالے۔ واقعی قسمت مجھ کو پریشان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایک رسالہ میں میری بیگم کے مضمون کے بالکل مقابل ایک ہندوستانی لیڈی کی تصویر آرٹ پیپر پر تھی اور اس کے نیچے صرف "ایم جہاں" کے الفاظ تحریر تھے۔ اس کے متعلق ایڈیٹر کے ریمارکس رسالہ کے شروع میں شذرات کے کالموں میں دیئے گئے تھے۔ آپ پنجاب کی کوئی اولوالعزم خاتون تھیں۔ جنھوں نے اول نمبر میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ صورت حال اب میرے سامنے تھی۔ قمر صاحب نے مضامین کو دیکھا۔ اس کے بعد اس رسالہ میں اس تصویر کو بھی دیکھا۔ خوش قسمتی سے ایم۔ جہاں پر مہر جہاں کا بھی اطلاق ہو سکتا ہے۔ جو میری بیگم کا مفروضہ نام تھا۔ صاحبہ تصویر کا تعارف بھی صفحہ تصویر پر نہ تھا۔ یہ تمام باتیں اتفاقات اور میری بدقسمتی سے یکجا ہو گئیں اور قمر صاحب کو اس پر جھوٹ کی عمارت کھڑی کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر تعجب تو یہ تھا کہ میرے گھر والوں نے اور ان کے گھر والوں نے رسالہ کے شذرات کو ذرا غور سے دیکھا ہوتا تاکہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور ایم جہاں

اور پھر جہاں ایک ہی ہیں یا دو۔ میں نے وہ رسالہ بیگ میں رکھ لیا اور باقی سب کو چلا دیا۔ نوکری کو استعفیٰ دیدیا۔ اور پہلی ہی گاڑی سے گھر روانہ ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ راستہ کس کرب و بیچینی سے کٹا ہے۔

جس وقت ہم نے مخبوط الحواسی کے عالم میں آواز دی ہے تو سب گھبرا گئے جب حقیقت معلوم ہوئی ہے تو ہمارے بھائی صاحب اس اتفاق اور ستم ظریفی پر باوجود مجھ سے محبت رکھنے کے اس قدر مجبور ہو گئے کہ میرے غم کا خیال بھی نہ رہا اور بیساختہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ادھر وہ ہنس رہے تھے۔ ادھر ہم منہ بسورے ہوئے بیٹھے تھے۔

آخر ان کو رحم آیا۔ وہ فوراً ہم کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے۔ ان کے والد کو اس واقعہ کی اصلیت کا علم ہوا ہے تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے مگر اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ قمر صاحب کے ساتھ آٹھ گھنٹہ قبل سارد ا ایکٹ کے ہوتے ہوئے بھی نکاح ہو چکا تھا۔ ہمارا واقعہ ایسا تھا کہ جو سنتا تھا وہ ہمارے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے۔ الٹا ہنستے ہنستے بیتاب ہو جاتا تھا۔

اس وقت ان تمام حالات کے اظہار سے یہی مقصد ہے کہ میری طرح جن لوگوں کی عنقریب شادیاں ہونے والی ہیں، اور وہ گھر سے دور بھی ہیں ان کو اگر دورہ مضمون نگاری ہو تو وہ گھونگھٹ کی آڑ لے کر میدان صحافت میں نہ اتریں۔ ورنہ میری طرح پچھتانا پڑیگا۔

اب میں ثبات عقل و درستی ہوش و حواس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ کہ میرے بیگمی مضامین جس جس نے بھی پڑھے ہیں وہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہ ایک مفروضہ ہستی تھی۔ اور میں ابھی تک کنوارا ہی ہوں۔ تاکہ آئندہ کوئی دوسرے قمر صاحب پیدا ہو کر میرے خلاف اس دشمنی کو دہرانہ دیں، جو پہلے کی جاچکی ہے۔ اگر اس اعلان کے بعد بھی کوئی صاحب مجھ کو شادی شدہ سمجھیں تو میں ان کی اس غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

(سالنامہ نیرنگ خیال)

روشن دماغ

سگریٹ کی ترکیب آگ، تمباکو اور لذت کے عناصر سے ہوئی ہے۔ جن میں سے آگ دوزخ سے، تمباکو ورجینیا سے اور لذت حضرت آدم کی لغزش اول سے حاصل کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آتشیں گناہ کی چنگاری نے ہمارے قلب کو سوز بخشا ہے اور ہماری ناک کو اس سوز کی گذرگاہ قرار دیا ہے۔ سر والٹر ریلے کا خادم بڑا عقلمند اور دور اندیش آدمی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے مالک کے نتھنوں سے دھواں نکلتے دیکھ کر ان کے سر پر پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی تھی تاکہ یہ لگی ہوئی آگ پھیلنے نہ پائے۔ اگر یہ محض آگ ہی ہوتی تو وہیں بجھ جاتی۔ لیکن وہ کیا کرے کہ یہ تو دھواں تھا۔ جو ہمیشہ نکلتا رہتا ہے۔ اور آگ سلگتی رہتی ہے۔

حضرت داغ نے حوروں کی فرسودگی کی بنا پر جنت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ہم میں سے تمام شاعر اور مضمون نگار باستثنا اس حقیر کے شاید سگریٹ ہی کی بنا پر جنت سے الٹے پاؤں واپس آجائیں بشرطیکہ وہاں ایڈیٹروں کا طبقہ موجود ہو اور وہ غلمان نمبر، حوض کوثر نمبر اور شاخ طوبیٰ

نمبر کی تیاریوں کے لئے ہم پر حسب عادت شدید تقاضے جاری رکھیں اس وقت ہم سگریٹ کی غیر موجودگی میں کس طرح ان کی فرمائش پوری کر سکتے ہیں؟

سگریٹ کا دھواں مضمون آفریں ہے۔ اور اسی بنا پر ہم نے اسے روشن دماغ کہا ہے۔ اس کے حلقے حسن، رقص اور نزاکت کے اجتماع سے جذبات کے زندہ گرّے بن جاتے ہیں۔ جو سگریٹ پینے والے کے گرد فضا میں نظام شمسی کے سیاروں کے طرح چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہ ایک شان کبریائی کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنے لبوں کی خفیف جنبشوں سے ہواؤں کا طوفان اٹھا کر پرانے کرّوں کو از سر نو تخلیق کرتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ یہ دود پارے طلسم خیال کی بندشوں میں قید ہو کر کاغذ کی سطح پر "شہ پاروں" کی شکل میں مستقل صورت نہ اختیار کر لیں۔ اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح لکھے ہوئے مضامین کے وزن، وسعت اور اثر کا تعین سوختہ سگریٹوں کے ٹکڑوں کو شمار کر کے کیا جا سکتا ہے۔ صاحب مضمون کو چاہیئے کہ وہ اپنے مضمون کی پیشانی پر اس شمارہ کو بخط جلی لکھ دیا کرے تاکہ اس کی "سگریٹ پاور" کو پڑھ کر ناظرین اس کے مضمون کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی طرح لگا لیا کریں کہ جس طرح برقی قمقمہ پر اس کی "کینڈل پاور" کو پڑھ لیتے ہیں۔ مضامین کے معیار اور اس کی سگریٹ پاور کو بڑھانے کیلئے اڈیٹروں کا فرض ہے کہ مضمون کی فرمائش کرنے سے قبل مضمون نگاروں کو اعلیٰ سگریٹوں

کے ڈبے پارسل کر دیا کریں۔

اسی سلسلے میں میں اپنے ایک دوست کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ جو مضامین تو لکھتے تھے لیکن ان کے اختتام پر اقتباس۔ نقل۔ سرقہ۔ ملخص اور ترجمہ لکھنا بھول جاتے تھے۔ میں نے اس طرف ان کو متوجہ کیا تو عذر کرنے لگے کہ طبعزاد مضامین دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں نے عرض کیا کہ اولاد اور مضمون طبعزاد پیدا کرنے کیلئے چند مجرب نسخے استعمال فرمایئے۔ اول الذکر کے لئے مفرح اور آخر الذکر کیلئے سگریٹ تیر بہدف ثابت ہونگے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔ کہ پہلی تجویز قبل از وقت ہے اور خارج از بحث اور دوسری تجویز مضر، کیونکہ سگریٹ کے ایک کش کی قیمت ہماری زندگی کا ایک قیمتی لمحہ ہے میں نے کہا اسی طرح طبعزاد مضمون کی ایک سطر بھی ہماری زندگی کا ایک لمحہ کم کر دیتی ہے۔ اس پر کہنے لگے کہ سگریٹ پی کر مضمون کی ایک سطر لکھنا گویا اپنی عمر کے دو قیمتی لمحوں کو فروخت کرنا ہے اور وہ بھی مفت۔ میں مسکرا کر خاموش ہو رہا کیونکہ اس کی تردید ناممکن تھی۔

بہر حال سگریٹ مضمون نگار کے لئے بیحد ضروری شے ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسروں کے لئے غیر ضروری ہے۔ اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ شادی شدہ کے لئے بیوی اور مجرد کے لئے سگریٹ بہترین مونس تنہائی ہیں۔ بشرطیکہ چند ضروری لوازمات بھی موجود ہوں۔

خصوصیت سے سگریٹ سے محظوظ ہونے کے لئے سرد ہوا، مرغن غذا اور آرام کرسی کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔

اس کے علاوہ سگریٹ حیلۂ تعارف اور وسیلۂ دوستی بھی ہے، پارک، ٹرین اور سینما میں عارضی یکجائی کے موقعوں پر گفتگو کا آغاز سگریٹ ہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ سگریٹ پیش کرنا احسان نہیں ہے بلکہ اخلاق ہے لیکن چونکہ انسان فطرتاً ممنون واقع ہوا ہے۔ اس لئے دل میں جگہ پیدا ہوہی جاتی ہے۔ اسی اصول پر بابوؤں اور کانسٹبلوں کو سگریٹ پلانا کبھی بیکار نہیں جاتا۔ یہ ایک قسم کا سرمایہ ہے کہ جو فوری نفع میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نیکی کرنے کے بعد قیامت تک انتظار کھینچنا پڑے۔ چنانچہ میرے ایک ہوشیار دوست سگریٹ ہی کے بل پر اکثر ہٹ دھرمی سے قانون اور اخلاق دونوں کو بالائے طاق رکھ کر غیر واجبی مراعات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور میں کہ جو ایک اطاعت گذار بندہ کی طرح قانون شکنی کو سرکار کی شان میں شرک خیال کرتا ہوں اکثر ایسے موقعوں پر نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کے چکر میں آجاتا ہوں ــــــ کیونکہ میں سگریٹ پینا جانتا ہوں، پلانے کے آرٹ سے واقف نہیں۔

سگریٹ جلد ایک حلقۂ احباب پیدا کر لیتا ہے لیکن اگر احتیاط نہ برتی جائے تو یہ حلقہ جلد ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ سماجی زندگی دراصل لین اور دین کے سیدھے سادے

اصول پر مبنی ہے۔ اس بیوہار میں ترازو کے دونوں پلڑے جب تک برابر نہیں ہوتے اس وقت تک کام نہیں چلتا۔ ٹھیک اسی اصول پر دوستوں میں سگریٹ کی لین دین بھی چلتی ہے۔ ہم سگریٹ دوستوں میں بددلی اور نفاق کا یہی سبب ہے کہ تم نے اپنے دوست کے جتنے سگریٹ پھونکے تھے اتنے واپس نہیں کئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سگریٹ اسی جنس میں واپس کئے جائیں۔ بلکہ جس طرح عید کے روز کسی دوست کی سویوں کے بدلے میں زردہ بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سگریٹ کا قرض پان یا چائے کی شکل میں ادا کیا جاسکتا ہے۔

"سگریٹ کش" دو قسم کے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب آدمیوں سے ہے نہ کہ پائپ سے، ایک ہنگامی اور دوسرے دائمی چنانچہ میں نوآموز سگریٹ کشوں کو مشورہ دونگا کہ وہ ہنگامی پینے والوں پر اپنی سگریٹ برباد نہ کریں کیونکہ نہ تو ان کو پینے میں لطف آئے گا اور نہ پلانے کا خیال پیدا ہوگا۔ البتہ دائمی قسم کے لوگ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں اور حلقہ "دود کشی" میں شامل کرنے کے لائق۔ چنانچہ میں اسی سلسلہ کا عادی مجرم ہوں۔ کیونکہ سگریٹ میری کمزوری ہے۔

میں اگر کسی سگریٹ سازی کے کارخانہ میں پہونچ جاؤں تو وہاں ایک ایسا سگریٹ تیار کروں جس کی لمبائی چوبیس گھنٹہ ہو۔ کیونکہ میں فکر میں

سگریٹ پھونکتا ہوں۔ خوشی میں پیتا ہوں اور غصہ میں چباتا ہوں۔ مجھ کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے انجن کا ضمیر عنایت فرمایا ہے۔ اور سگریٹ کو ایک مزید عضو کی شکل میں میرے ہونٹھوں پر چپاں کر دیا ہے۔ تاکہ دود کش کا کام دے سکے۔ اس لئے میں تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ان لمحات کو کہ جو ایک سگریٹ کے ختم ہونے اور دوسرے کے جلنے تک وقوع پذیر ہوتے ہیں "کن" کی مدد سے معدوم کر دیتا ہوں۔

میں ہر مہینہ کے ابتدائی دور میں اپنے دوستوں کے ساتھ سگریٹ کشی کی محفلیں منعقد کرتا ہوں۔ میری خوابگاہ کی کھڑکی میں سے مخصوص طریقہ سے اتوار کو اس طرح مسلسل دھواں نکلا کرتا ہے کہ جیسے شاہی مہمان خانے کے باورچی خانہ میں سے۔ مہینہ کے آخری دور میں میں اپنے مکان کی نشست ترک کر دیتا ہوں۔ کیونکہ اس زمانے میں مجھے اپنے دوستوں سے قرض وصول کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ جس روز کسی نادہند دوست سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس روز میں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں ہی پر قناعت کر لیتا ہوں جب وہ بھی باقی نہیں رہتے تو میں دعا کرتا ہوں کہ کسی طرح لوٹ پوٹ کر مجسم سگریٹ بن جاؤں۔ تاکہ میں سگریٹ کو پیؤں اور سگریٹ مجھ کو پیئے اور فی الواقعی یہ دعا قبول بھی ہو جاتی ہے کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جل رہا ہوں مگر سر یا پیروں کی طرف سے نہیں بلکہ قلب کے درمیانی حصے سے۔

میں چاہتا ہوں کہ سگریٹ مجھ کو چھوڑ دے۔ کیونکہ میں اس کے چھوڑنے
پر قادر نہیں۔ میں اس کو ہزار بار آزما چکا ہوں۔ میں احرام باندھ کر نیت کرتا
ہوں کہ آج سے سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ لیکن میں اپنے سگریٹ دان پر
نظر کرتا ہوں تو اس میں رکھے ہوئے سگریٹوں کے برباد جانے پر متفکر ہو جاتا ہوں
اس لئے باقی ماندہ سگریٹوں کو یکبارگی سلگا لیتا ہوں۔ تاکہ یہ قصہ جلد ختم ہو جائے
ان کو ایندھن کی لکڑیوں کی طرح جلا ڈالنے کے بعد میں سگریٹ دان، دُود
کش (پائپ) اور آگ پیٹی (دیا سلائی) کو بابر کے ظروف مے نوشی کی طرح،
یا تو دریا بُرد کرنے کا ارادہ کرتا ہوں، یا اپنے کسی جانی دشمن کو پیش کرنے کا
لیکن اسی دوران میں مجھے کچھ خلش سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ کچھ کھو گیا ہے۔ اسی اثنا میں یاد آتا ہے کہ مجھے ایک موقر رسالہ
کے لئے کچھ لکھنا ہے۔ اور وہ شروع بھی نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ "روشن
دماغ" سے شغل نہ کیا جائے۔ لیجئے میں اپنے نوکر کو آواز دیتا ہوں لیکن
وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ کیونکہ میں اس سے قبل اس کو تنبیہ کر چکا ہوں کہ وہ
سگریٹ کے معاملہ میں میرا کہا نہ سُنے۔ آخر ش میں مجبوراً خود اٹھتا ہوں
اور قریب کے رسٹوران سے ڈبیہ خرید کر واپس ہوتا ہوں۔ اور پھر اسی
زہریلی فضا میں محصور ہو جاتا ہوں۔ رات کو مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آتا ہے
تو میں فرطِ طیش سے بیقرار ہو کر تازہ سلگایا ہوا سگریٹ زمین پر پھینک کر

سو جاتا ہوں۔ اور تین مرتبہ پکار پکار کر کہتا ہوں "اب سگریٹ کبھی نہ پیونگا"
صبح کو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ تکئے کے نیچے سگریٹ دان کی تلاش میں مشغول
ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دیکھتا ہوں کہ وہ بالکل ہی خالی ہے تو بیقرار ہو جاتا ہوں
معاً مجھے رات کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا خیال آتا ہے۔ میں دیوانہ وار اس
کی طرف دوڑتا ہوں۔ اور جب دیکھتا ہوں کہ واقعی وہ میرے پائدان کے
قریب پڑا ہوا میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہے تو میرے چہرے پر
بھی تبسم کھیلنے لگتا ہے۔

(نیرنگ خیال)

مول تول!

خانم ۔ (خود بخود) سُنتی ہوں کہ کلکتہ اور بمبئی میں کئی کالج ہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو مال فروخت کرنا سکھایا جاتا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا کوئی کالج نہیں جس میں مال خرید نا سکھایا جاتا ہو۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ اس طرف توجہ کرے تو میں سب سے پہنچے کے درجہ میں اپنے پروفیسر صاحب کو داخل کرادوں کیا کروں میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں ۔ ورنہ اس فن پر ایک اچھی خاصی کتاب لکھ کر بتا دیتی ۔ خاص طور سے وہ انگریزی پڑھے ہوئے جنٹلمینوں کیلئے بہت مفید ثابت ہوتی جو بازار جاتے ہیں تو میرے پروفیسر کی طرح دونوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں ۔ اور ہاتھوں کی مٹھیاں کھول دیتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت دوکانداروں کے یہاں گھی کے چراغ جلتے ہیں ۔ اور ہماری مظلوم بہنوں کے یہاں پانی کے ۔

(عرشی باہر سے آتا ہے)

عرشی ۔ بھابی جان! اسیتا پوچھتا ہے کہ دہی منگوایا جائیگا یا نہیں ؟

خانم ۔ (چونکتے ہوئے) ہاں ، کیوں نہیں ! پروفیسر صاحب دہی بغیر

ایک دن بھی نہ جئیں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر میں مر جاؤں تو دہی کے پانی سے غسل دیا جائے اور اسکی بالائی پر فاتحہ۔

عرشی۔ خیر اس کا انتظام تو بعد کو کیا جائیگا۔ اس وقت کتنی ضرورت ہے؟

خانم۔ کتنا بتاؤں؟ سارے گھر کو اس کا چسکہ لگ گیا ہے۔ واقعی ہے بھی مفید چیز۔ ہاضم طعام۔ مقوی دماغ۔ کاسر ریاح۔ مسکن قلب۔ دافع اختلاج وحدت جگر (عرشی مسکراتا ہے) اے ہنستے کیوں ہو۔ روز سنتے سنتے یہ الفاظ حفظ ہو گئے ہیں۔

(لو دہی۔ باہر سے ایک گھوسن کی آواز آتی ہے)

ہاں خوب یاد آیا۔ میں موئے چوٹے مسیتا سے کبھی نہ منگواؤں گی۔ لاتے لاتے اوپر کی بالائی خود چٹ کر جاتا ہے۔ اور پھوکس ہم کو دیتا ہے۔ آج میں گھوسن سے خود خریدونگی۔ (عرشی اٹھنے کا ارادہ کرتا ہے) بیٹھے رہو۔ دہی والی اپنے خریداروں کو خود ڈھونڈھ لیگی۔ مگر جناب ذرا خاموش بیٹھیئے گا۔ میں سودا خریدتے وقت کسی کا ٹپ ٹپ بولنا پسند نہیں کرتی۔ دیکھو اور تجربہ حاصل کرو کہ میں کس عقلمندی اور ہوشیاری سے سودا چکاؤں گی۔ اس مول تول والے معاملہ میں بندی سب کو مات دے سکتی ہے (خود اپنی پیٹھ ٹھونک کر) میرا اصول ہے کہ دام کم سے کم دیتی ہوں اور مال زیادہ سے زیادہ لیتی ہوں۔

عرشی۔ (مسکرا کر) خطا معاف بھابی جان، کہیں بھائی جان کو آپ

اپنا ہم خیال نہ بنا لیجیئے گا۔ ورنہ وہ ایک کامدانی کی قیمتی ساڑھی کے بجائے ایک درجن کھدّر کی ساڑھیوں ہی پر اکتفا کرینگے۔

خانم۔ مان گئی بھائی، تم کبھی کبھی ایک آدھ بات عقلمندی کی بھی کہہ جاتے ہو۔

گھوسن۔ (دروازے میں داخل ہوتے ہوئے) دہی چاہیئے سرکار؟

عرشی۔ ہاں ہاں بڑی سخت ضرورت ہے۔ تمھارا ہی انتظار تھا دیئے جاؤ۔

خانم۔ (باواز) کس کو ضرورت ہے بھئی! مجھ کو تو نہیں چاہیئے (عرشی سے) تم خاموش کیوں نہیں بیٹھتے۔ ضرورت ظاہر کر کے اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچا دیا۔ اب وہ ضرور اکڑ جائیگی۔ تم اتنا نہیں جانتے کہ لا دہی اور لے دہی میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ سودا خریدنے کا پہلا گر ہمیشہ یاد رکھو کہ دوکاندار سر ٹپک کر مر جائے مگر یہ کبھی نہ بتاؤ کہ تم کو کس چیز کی ضرورت ہے (گھوسن صحن میں کھڑی ہو جاتی ہے)۔ (گھوسن سے) اے عورت خالی دہی بیچنے سے ہے کیا؟

گھوسن۔ آج کل اسی کی نکاسی ہے بیگم صاحب۔

خانم۔ چھی۔ دہی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ جو خریدا جائے۔ لوگ بھی کتنے بیوقوف ہیں کہ پھٹے ہوئے دودھ کو کس شوق سے لے کر کھاتے ہیں (عرشی کو ہنسی آتی ہے) میں خیال کرتی ہوں کہ جتنے امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اتنے کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ بدہضمی۔ قراقر۔ ریاح۔ بادی بواسیر۔ دردسر کی بیماریاں اسی کے دم قدم سے ہیں۔ جاؤ بیوی کہیں دوسرا گھر دیکھو یہاں برکت ہے۔

گھوسن۔ حضور ذرا چکھ کر تو دیکھئے۔ پھر جو جی چاہے کہئے گا۔ بیری والے نواب صاحب اس پر سے پلاؤ بریانی قربان کرتے ہیں۔

خانم۔ نوج میں دہی چکھوں۔ ایک مرتبہ جب میں چار برس کی تھی تو میری انا نے ایک ہی انگلی چٹا دیا تھا۔ جب سے اُبکائیوں کا مرض ہو گیا تھا بھئی اپنا اپنا مزاج ہے۔

گھوسن۔ آپ کی خوشی بیگم صاحب۔ جاتی ہوں۔ بندگی۔

(دروازے کی طرف مڑتی ہے)

خانم۔ اے یہ دہی والی تو بڑی تمیز دار معلوم ہوتی ہے۔ کیسی لچھے دار باتیں کرتی ہے۔ صورت بھی انسانوں کی سی ہے۔ بھولی بھالی۔ اے ذرا بات تو سُن (گھوسن پلٹ آتی ہے) تیرا کیا نام ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ آئے ہے تو تو پسینے میں تر ہے۔ برف کا پانی نہ پیئے گی؟

گھوسن۔ اللہ آپ کا جی سکھی رکھے۔ کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ میں ابھی کنوئیں کا ٹھنڈا جل پی کر آئی ہوں۔

گھوسن۔ تیری قسمت ہی میں نہیں ہے بیٹھ! بیٹھ نگوڑی (دہی والی بیٹھ جاتی ہے) تیرے بچے وچے ہیں یا نہیں، روٹی کھائیگی تو؟

گھوسن۔ جی نہیں سرکار، آپ کا دیا میرے گھر پر سب کچھ موجود ہے، صبح کھا کر چلی تھی۔

خانم۔ ہاہ! مجھے تیری حالت پر رحم آتا ہے۔ پھول سی صورت دھوپ

میں جھلس کر رہ گئی ہے ۔ روکھی سوکھی روٹی کھا کر چلی ہوگی ؟ کیا کہوں گھوسن ! نہ معلوم میرا دل تیری طرف کیوں کھچا جاتا ہے ۔ تیــــری آنکھ میں موہنی ہے کیا ؟ پان تمباکو کھائیگی کیا ؟

عرشی ۔ (علیحدہ) مجھکو تو اس کی آنکھ میں موتیا بن نظر آرہا ہے ۔

گھوسن ۔ جی نہیں ، ایک مرتبہ جب میں چار برس کی تھی تو کھایا تھا جب سے مجھے ــــــــــ ،

خانم ۔ ابکائیوں کا مرض ہوگیا ۔ ہاں تب تو میری اور تیری طبیعت ایک سی ہے ۔ میری طرح تو بھی نازک لہر معلوم ہوتی ہے ۔ میں تجھ سے ایک بات پوچھوں ، تو مجھ سے بہن آپا کریگی ؟ (عرشی سے) ذرا چھری تو لاؤ ۔ میں اس کو خربوزہ کھلاؤنگی ۔ (گھوسن سے) کیوں کھائیگی ؟ (عرشی سے) یہ دوسرا گر بتاتی ہوں ، دوکاندار سے سودا خریدنے سے پہلے دوستی کر لیا کرو ۔ سمجھے ؟

گھوسن ۔ بیگم میں ہندو جاتی ہوں ۔

خانم ۔ اے ہے تو جب سے چھپا رہی تھی پہلے سے کیوں نہ کہا ۔ میں اتنی دیر میں ہمسائے کے برہمن سے تیری رسوئی کا انتظام کرا دیتی ۔ میں تجھ سے بہن آپا کر کے بہت خوش ہوئی ۔ سچ کہتی ہوں مجھے ہندو بہت پسند ہیں صفائی ایمانداری ، محبت و وفاداری سب کچھ موجود ہے ۔ (عرشی سے) دیکھو اس کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نفع لیتی ہی نہ ہوگی بھئی مسلمان تو دوگنے دام لیتے ہیں

عرشی ۔ جب کوئی خریدتا ہی نہیں تو کیا کریں ۔
گھوسن ۔ آج کل تو میں لاگت سے بھی دو آنے کم پر بیچتی ہوں ۔
عرشی ۔ کیا کہنا ۔ دہی فنڈ کی متولی ہے نا ۔
خانم ۔ ہاں ! اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی آج سے دہی کھانا شروع کردونگی
اور روزانہ تجھ ہی سے لیا کرونگی ۔
عرشی ۔ کہیں ایسا غضب نہ کیجیئے گا ۔ ابکائیوں کا مرض پھر پیدا ہو جائیگا ۔
خانم ۔ اونہہ ۔ جان جائے یا رہے ۔ اپنی بہن آپن کی خاطر یہ بھی سہی میرا
مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کی آمدنی ہو کسی طرح ۔ غریبوں کی آمدنی بڑھانا ہمارا
فرض ہے بنو ! (باآواز) مینا سے باہر جا کر کہو کہ خبردار ہمارے دروازے پر کوئی
دوسری گھوسن قدم نہ رکھنے پائے ورنہ ٹانگیں توڑوا دونگی ۔
گھوسن ۔ نہیں حضور ایسا ظلم نہ کرائیے گا ۔ پرمیشور آپ کو سلامت رکھے
سب اپنی اپنی قسمت اور دھن کا کھاتے ہیں ۔
خانم ۔ (عرشی سے) تیسرا گر بتاتی ہوں ، دکاندار کو نفع کرانے کی تھپکی دینا
دینا چاہیئے تاکہ وہ لالچ سے اندھا بن جائے اور سیر کی جگہ سوا سیر تول جائے ۔
عرشی ۔ (علیحدہ) گویا کمیشن ایجنٹ ہو جانا چاہیئے ۔
خانم ۔ (گھوسن سے) تیرا مال میں اپنی سہیلیوں کے یہاں بکوا دیا کرونگی
اور اپنے میکے میں بھی تیری سفارش کر دونگی ۔ وہ لوگ اتنے رئیس ہیں کہ

مُنہ مانگے دام دینگے۔ مُردار! تو چند دن میں سونے کے زیور نہ بنوا لے تو میرا ذمہ مگر شرط یہی ہے کہ تو مجھکو ——،

گھوسن۔ (بات کاٹ کر) سرکار! آپ کی جوتیوں کے طفیل، میرے مال کا اتنا مان ہے کہ ایک دو ڈیوڑھیوں کو پورا نہیں پڑتا۔ کہاں تک بتاؤں رام کرے کھانے والے سلامت رہیں۔ سونے کا زیور تو اب بھی گھر پڑا ہے آپ کے سامنے کس مُنہ سے پہنوں۔

عرشی۔ سرکار کیوں کہتی ہے۔ بہن کیوں نہیں کہتی اب۔

گھوسن۔ (ہنس کر) بھیا کی باتیں۔

خانم۔ ہاں وہ تمھاری طرح زبانی جمع خرچ نہیں کرتی۔ مُنہ سے نہ کہا تو کیا ہوا، دل میں تو سمجھتی ہے۔ بہن! میں ایک شرط سے دہی لونگی۔ تم کو اس کے پیسے لینا پڑینگے۔ اقرار کر لو پہلے۔ وہ اور بات ہے کہ نفع نہ لو مجھ سے۔ مگر لاگت تو میں زبردستی دونگی ——— گھوڑا اپنی گھاس سے دوستی کریگا تو کھائے گا کیا۔؟

گھوسن۔ اے حضور آپ کیوں فکر کرتی ہیں اسکی۔ کے پیسلی کا دہی ہوگا بس تو بڑی امیدیں لے کر اس دروازے پر آئی ہوں۔ اللہ آپ کی عمر ہزاروں برس کی کرے۔ آپ دیتے دیتے تھک جائیے گا۔ مگر میں لیتے لیتے نہ تھکوں گی۔

عرشی ۔ (علیحدہ) شاباش دہی والی ۔ تو بھی سودا بیچنے کے گروں سے واقف معلوم ہوتی ہے۔
خانم ۔ (چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں) اچھا دیکھیں تمہارا دہی ۔ (گھوسن خونچہ پر سے کپڑا ہٹاتی ہے ۔ خانم جھک کر دہی کے کونڈے کو دیکھتی ہے) (علیحدہ) دہی تو بڑا نفیس معلوم ہوتا ہے (عرشی سے) چوکھا گر بتاتی ہوں ۔ دوکاندار کے پاس خدا کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بھی ہوں تب بھی ان میں دو چار عیب ضرور نکال دینا ۔ (گھوسن سے ناک چڑھا کر) بیٹی جیسی تمہاری باتیں ہیں ویسا تو دہی نہیں ہے ۔ اے ہے کیسا سفید ہے ۔ کچھ میٹھی میٹھی بو بھی آ رہی ہے ۔ شاید تمہارے جانور مہوے کے پھول کھاتے ہیں ۔ جبھی ۔ ان پھولوں کی شراب بنتی ہے ، معلوم نہیں اس دہی کا کھانا شرع سے جائز ہے یا نہیں ۔ خیر اس وقت تو شک کا مسئلہ ہے ۔ مولوی صاحب سے پھر دریافت کراؤنگی مگر بالائی کی تہہ اتنی موٹی کیوں ہے چکنائی بھی بہت ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے ریشے میری آنتوں میں جا کر پھنس جائیں ثقیل ہوتے ہیں ۔ خیر ڈاکٹر سے پھر کبھی پوچھونگی ۔ اپنی بہن آپن کی خاطر دین اور دنیا دونوں کی تکلیف اٹھانا پڑے تب بھی کوئی ہرج نہیں ۔ (عرشی سے) کیوں جی چکھنا چاہیئے !

گھوسن ۔ اے چکھنا کیسا ! کھا کر دیکھیئے ۔

خانم ۔ بنن ۔ رفن ۔ بانو ۔ تم سب آ کر دہی چکھو (بچے دوڑتے ہوئے آتے ہیں) مگر دیکھو سچ سچ بتانا کہ کیسا ہے ؟

(خانم ۔ بنن ۔ رفن ۔ بانو اپنے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں ۔ دہی والی ہچکچاتی ہے ۔ مگر آنکھیں بدل کر تھوڑا تھوڑا رکھدیتی ہے ۔)

عرشی ۔ میں ایک ہاتھ پھیلاؤں یا دونوں ؟

خانم ۔ تم زبان نکالو (علیحدہ) کیا خوش ذائقہ دہی ہے ۔ سبحان اللہ (گھوسن سے) دہی کھانے کے قابل تو نہیں ہے جیسی صورت ہے ویسا مزا بھی ہے (بچوں کو آنکھ کا اشارہ کرتی ہے) پھیکا !

بنن ۔ (اماں کو دیکھ کر) نہیں اماں یہ تو کڑوا ہے ۔

رفن ۔ ارے واہ یہ تو چٹپٹا ہے ۔

بانو ۔ کہیں ہو بھی نہیں ۔ یہ تو کھٹا ہے ۔

گھوسن ۔ (علیحدہ) یہ دوانی ہنڈیا تھوڑی ہے کہ سب مزے موجود ہوں (خانم پانی سے کلی کرتی ہے)

بنن ۔ اماں میرا جی متلاتا ہے ۔

رفن ۔ مجھے اُبکائی آتی ہے ۔

بانو ۔ میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے ۔

گھوسن ۔ (علیحدہ) اے بھگوان !

خانم ۔ (عرشی سے) پانچواں گر یاد رکھو ۔ دوکاندار کے سامنے اس بات کا تذکرہ ضرور کرو کہ تم کسی پولیس افیسر کے دوست یا عزیز ہو ۔ اس سے دل پر

رعب بیٹھتا ہے۔ (گھوسن سے) ہے ہے کیا کروں۔ یہ کیسا دہی ہے تمہارا۔؟ جاؤ بچو۔ میں تمہارے قربان! لاؤ کھاؤ ہوا میں ٹہلو۔ تھوڑی دیر میں طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔ مگر خاموش رہنا کسی سے کہنا نہیں۔ نہ معلوم پولیس کو خبر ہو جائے تو بچاری کا خونچہ چھین کر حوالات میں بھیجدیگی (بچے باہر کی طرف جاتے ہیں) ہے ہے کہاں چلے؟ خدا کے لئے کہیں چچا جان خانبہادر سیّد دلاور علی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس نہ چلے جانا۔ ہاں اور کیا۔ وہ تو ہر ایک کے پیچھے ہتھکڑیاں لئے پھرتے ہیں۔ میں کسی غریب کو ستانا نہیں چاہتی اور پھر یہ تو میری بہن اپن ہے۔ کیوں ہے نہ ٹھیک؟

گھوسن۔ اے واہ بیوی، اچھی دھمکی دیتی ہیں آپ۔ میں کسی دیہات کی رہنے والی نہیں ہوں جو ڈر جاؤنگی۔ (اٹھتی ہے) میں راجے مہاراجے کی ڈیوڑھیوں پر جانے والی ہوں اس مال کی قدر وہی لوگ خوب کرتے ہیں۔ نہ بنیا ایک نہ دینا دو (خونچہ اٹھاتی ہے)

عرشی۔ بھابی جان پانچویں گر میں ترمیم کرنا پڑیگی۔ آپ کو اس کا پانسہ الٹنا پڑیگا۔

خانم۔ اچھا دام بول دام، کیا بھاؤ دیگی۔

گھوسن۔ بیوی کیا کروگی لیکے۔ میرا دہی پھیکا ہے۔ کڑوا ہے۔ کھٹا ہے۔ کچا ہے۔ اس میں کچھ ملا ہوا بھی ہے۔ (خونچہ سر پر رکھتی ہے)

خانم۔ اے ایک دام بولو، ایک دام۔

گھوسن ۔ مجھے بیچنا ہی نہیں ہے بیوی ۔ ایسا دہی روز بیچیں تو فاقے مرنے لگیں

خانم ۔ (غصہ میں) بس خاموش چھچھوندر اگلہری ۔ بنو (باواز) سبینا سے باہر جاکر کہو کہ خبردار ہمارے دروازے پر یہ گھوسن قدم نہ رکھنے پائے ورنہ ٹانگیں توڑوا دونگی ۔

عرشی ۔ (مسکراکر) بہن آپ نہ ہے بھابی جان!

خانم ۔ اسی بات کا تو خیال ہے ـــــ ورنہ!

عرشی ۔ مگر جھگڑا کرتو بنایا ہی نہیں ۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ صرف دہی بکھائی ہوئی ۔ ابھی مول تول کے اہم مسئلے تو یونہی رہ گئے (گھڑی دیکھکر) اس ناٹک کا پروگرام ابھی آدھا ہی دکھایا گیا ۔ اس پر بھی ایک گھنٹہ تیرہ منٹ صرف ہوئے اگر پورا پروگرام ہوتا تو تین گھنٹے لگتے ۔

خانم ۔ کیا بجا ہے عرشی ؟

عرشی ۔ ایک بجکر پچیس منٹ !

خانم ۔ (پریشان ہوکر) ہے ہے آج پروفیسر صاحب بھوکے ہی رہ گئے بارہ بجے کھا لیتے تھے وہ ۔ مگر میری کیا خطا ہے ۔ کھانا تو صبح ہی تیار ہو گیا تھا ۔ یہ دہی کے جھگڑے میں روز دیر ہو جاتی ہے ۔ آج میں ان سے صاف کہدونگی کہ بابا مجھ سے دہی کا انتظام نہیں ہوسکتا ۔ (عرشی سے) جاؤ سبینا سے کہو کہ لپک کر دہی تو لے آئے ۔

مسیکتا۔ (باہر سے) وہی اس وقت نہیں ملیگا۔ آج کل بارہ بجے کے بعد کہیں نام کو بھی باقی نہیں رہتا۔

(پروفیسر باہر سے داخل ہوتے ہیں)

پروفیسر۔ آج مجھ کو بھوکا ہی مار ڈالا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ اگر آپ سے میرے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تو صاف کہہ دیجئے۔ ہوٹل موجود ہیں۔

خانم۔ شوق سے جناب! روکا کس نے ہے! پہلے وجہ تو پوچھی ہوتی آپنے یہ آپکے دہی کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ کب سے ڈھونڈھ رہی ہوں۔ ملتا ہی نہیں۔

پروفیسر۔ یا قیمت طے نہیں ہوتی؟

(ڈراپ)

(عصمت)

دُکھی داسی

اسپتال کی بنیاد ڈاکٹر، نشتر، جلاب، کلوروفارم، اور نرس کے عناصرِ خمسہ پر قائم ہے۔ جن میں سے ہر ایک عنصر انسان کے حواسِ خمسہ کو معطل کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس مکان میں مریض کی زندگی اس کی حسیات کی موت سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں موت کس حالت کا نام ہے اور زندگی کس کیفیت کا۔ اگر کوئی حقیقت کہی جا سکتی ہے تو وہ زندگی، اور موت کا مکسچر ہے۔ جس کی ابتدا کلوروفارم ہے اور انتہا نرس ــــ درمیانی لمحوں میں نشتر، ڈاکٹر اور جلاب کی کارفرمائی رہتی ہے۔ جس سے سردست ہم کو بحث نہیں۔ البتہ کلوروفارم اور نرس مریض کے مدت قیام میں ہمیشہ ایک دوسرے کے مددومعاون رہتے ہیں۔ جس وقت ایک کے اثرات زائل ہونا شروع ہوتے ہیں تو دوسری کے تاثرات شروع ہو جاتے ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں زخم کی ٹیس کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

انسان عالمِ آخرت کی گتھی سلجھانے سے اب تک قاصر رہا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کہ یہ حجابوں کی دنیا ناقابلِ انکشاف ہے۔ لیکن اس لئے ابھی تک اسپتال کی

ترکیب پر غور نہیں کیا۔ اس میں عالم کون و مکان اور عالم عقبیٰ دونوں موجود ہیں اور ان دونوں کے درمیان آپریشن کی منزل گویا موت کی منزل ہے۔ اس لئے موت کا مزہ روحوں سے پوچھنے کی کوشش مت کرو۔ بلکہ آپریشن شدہ مریضوں سے پوچھو۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ موت آپریشن کے عمل کی طرح محسوس نہیں کی جا سکتی مگر دونوں کے ابتدائی مراحل ہوش اور بیہوشی کی کشمکش کی وجہ سے بے حد تلخ ہو جاتے ہیں اور اس وقت انسان کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے جو ململ کے دوپٹہ کو بیری کے درخت پر پھیلا کر کھینچنے سے ہوتی ہے۔ ایک عرصہ کیلئے مریض سکوت کی ایک گہری فضا میں سانس لیتا ہے جہاں اس کے تمام احساسات رفتہ رفتہ مُردہ ہو جاتے ہیں۔ بیہوشی کے ایک لامتناہی وقفہ کے بعد مریض کی آنکھ کھلتی ہے۔ اپنے سرہانے وہ یا تو حوروں کو کھڑا دیکھتا ہے اور یا نرسوں کو۔ وہ گھبرا کر پکار اٹھتا ہے۔ کہ میں کہاں ہوں ــ؟ جنت میں یا اسپتال میں۔ لیکن معاً اس کی نظر آلہ تپش پیما پر جاتی ہے اور وہ خیال کر لیتا ہے کہ میں اسپتال ہی میں ہوں۔ کیونکہ حوروں کے پاس یہ آلہ نہیں ہوتا۔ جنت کی دنیا سرد ہے۔ وہاں حرارت اور تپش کا کیا کام اور جذبات کے بخار سے کیا واسطہ؟

کوئی عورت حور نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس میں عمر کا لامتناہی سلسلہ درکار ہے لیکن ہر عورت نرس بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس جوانی۔ دلداری اور

آلۂ تپش پیدا ہو۔ بدصورت نرسیں مریض کی آنکھوں میں تنکے کی طرح کھٹکتی ہیں
اور بوڑھی نرسیں ایک لاعلاج مرض کی طرح اس کے سر پر مسلط ہو جاتی
ہیں۔ جن سے چھٹکارا پانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ دونوں میں سے کسی
ایک کی موت ہے۔ بشرطیکہ فوری ہو۔ نبض کی رفتار سے قلب کی حرکت
اور درجہ حرارت سے جذبات کے اتار چڑھاؤ کا پتہ لگالینا اس کا اہم فریضہ ہے
اور اس لئے مریض کی قلبی کیفیات اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہیں
خواہ وہ (مریض) زبان سے اس کا تذکرہ کرے یا نہ کرے۔ اسی لئے وہ مریض
کے معاملہ میں مخصوص طریقہ سے روشن ضمیر کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ
معذور مریضوں کے لئے دوا۔ تندرست مریضوں (نایاب نہیں ہیں)
کے لئے ٹانک اور ڈاکٹروں کیلئے آلۂ تفریح ہے۔

مریض ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں اور مرنے یا صحت پا جانے کے
بعد وہاں سے خارج کر دیئے جاتے ہیں لیکن وہ مریض کے بستر کی طرح ہسپتال
ہی میں قائم رہتی ہے۔ بشرطیکہ خود مستعفی نہ ہو جائے۔ مگر ایسی صورت شادی
سے پہلے یا اس کے آثار نمودار ہو جانے کے بعد ہی رونما ہوتی ہے۔

دکھی داسی (نرس) بالک داسی (استانی) اور دیو داسی (رآہم)
گو ایک دوسرے سے مختلف فرائض انجام دیتی ہیں۔ لیکن ایک لحاظ سے
صورت مشترک رکھتی ہیں۔ یعنی ان سب کا ظاہر باطن ایک ہے۔ اور

ان کے لئے گھر اور باہر یکساں۔ مخصوص طریقے سے نرس ازدواجی جکڑبندیوں کی قانونی صورت سے آزاد ہے۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ ہسپتال ہی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کمسن مریض اس کی اولاد۔ مسن مریض اس کے والدین اور نوجوان مریض اس کے منگیتر۔ اس لحاظ سے وہ سدا سہاگن کہی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی مسرت کے وقفے بے حد قلیل ہوتے ہیں اس لئے وہ دراصل بیوۂ مسلسل ہی ہے۔ سفید لباس اس امر کی مزید تائید کرتا ہے۔

جیل کی طرح ہسپتال بھی انسانی کمزوریوں کی تماشہ گاہ ہے جہاں اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ زندگی ہی میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے مجرموں میں فرق اتنا ہی ہے کہ ایک انسانی قوانین توڑتا ہے اور دوسرا فطری۔ پہلے کی سزا متعین مگر غیر یقینی ہوتی ہے۔ اور دوسرے کی سزا غیر متعین مگر یقینی۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کبھی کبھی رشوت لے کر مجرم کو آزاد کر دیتی ہے۔ لیکن جراثیم کبھی رشوت نہیں لیتے۔

موت اور زندگی کی اس کشمکش میں تہذیب کی نقاب پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور انسان اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگتا ہے۔ فطرت انسانی کی اس عریانی کا مشاہدہ کرنے والی اس وقت نرس ہی ہوتی ہے کیونکہ ڈاکٹر کے مقابلہ میں اس کا ہر وقت مریضوں کی صحبت میں

زیادہ گذرتا ہے۔

اس تماشہ گاہ میں یہی ایک ایسی ہستی ہے کہ جو بلا ٹکٹ نہیں
بیٹھتی بلکہ ایک بڑی قیمت ادا کرتی ہے اور وہ اس کی ہمہ وقت تیار مہندی
ہے کہ ادھر بٹن دبایا اور ادھر وہ تبسم کا جال لے کر موت کا شکار کرنے نکل
کھڑی ہوئی اور اپنے ماحول کے سوز کو اپنی فطرت کے ساز سے شکست دینے
چلی۔ درد و آلام کی چیخوں اور آنسوؤں کے سیلاب میں وہ پیدا ہوتی ہے۔
اور وہیں مر بھی جاتی ہے۔ اگر وہ مریضوں کے نالوں کا جواب قہقہوں سے
نہ دے تو ان کی ایک ہی چیخ اس کی زندگی کے لمحوں کو ختم کر دینے کے
لئے کافی ہے۔ وہ رونا فراموش کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس کے غم کا کوئی شریک
نہیں، البتہ وہ اپنی زندگی کا فلسفہ

"میں نے اک بے خوف ہنسی میں غرق کیا طوفانوں کو"

قرار دے لیتی ہے۔ کیونکہ سب کا غم اسی کے لئے ہے۔ البتہ اس سے یہ
نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کے قہقہے قلب کی گہرائیوں سے پیدا
ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دوا کے کڑوے گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اترتے
ہی نہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تیمارداری کی مشین بن
کر رہ جاتی ہے۔ یا جنت کی حور جو ضمیر سے عاری اور جذبات سے خالی
ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی شراب کی بوتل ہے۔ کہ جس کے منہ سے

کاگ اڑ گیا ہو۔ اس لئے وہ رندوں کے جام میں انڈیلی نہیں جا سکتی۔ بلکہ مریضوں کے حلق میں ٹپکائی جا سکتی ہے۔

مثلث، مریض، نرس اور ڈاکٹر کے دو اضلاع ہم کھینچ چکے ہیں رہ گیا تیسرا ضلع، سو وہ اس قدر اہم ہے کہ ہم اگر اس سے قطع نظر کر لیں، تو ہمارا مثلث نامکمل ہی رہ جائے گا۔ اس کی تکمیل کیلئے ہم کو ڈاکٹر کی خشت اوّل یعنی میڈیکل کالج کے طالب علم کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔

یوں تو ہر طالب علم اختلال دماغ کا شکار ہوتا ہے۔ اور ہر اس عورت کو کہ جو اس کے قریب سے گذر جاتی ہے محبت کا پیام دے بیٹھتا ہے لیکن میڈیکل کالج کا طالب علم اس کلیّہ سے مستثنیٰ ہے۔ مشق کے ابتدائی دور میں جب وہ پہلی مرتبہ انسانی لاش کو دیکھتا ہے۔ تو اس کے قریب مسرّت اور خوف کے جذبات لے کر جاتا ہے۔ بالکل اس بچّے کی طرح جو ربڑ کے سانپ کو خرید کر کلکاریاں بھی مارتا ہے لیکن اس کو چھوتے ہوئے ڈرتا بھی ہے۔ کہ مبادا کاٹ نہ کھائے رفتہ رفتہ خوف دور ہوتا ہے اور وہ بچّہ سانپ کا مُنہ پکڑ کر اس کو اپنے مُنہ میں رکھ کر چوسنے لگتا ہے۔ اسی طرح ہمارا نوجوان ڈاکٹر بھی مُردہ جسم کو کُرید کُرید کر دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی چیز

دیکھنے کے قابل رہتی ہی نہیں، اس کے بعد اُس کی نگاہوں میں انسان کا جسم اتنا ہی معمولی ہو جاتا ہے۔ کہ جیسے انجینیر کی نظروں میں ٹوٹی ہوئی مشین۔ وہ عورت کو ایک زندہ لاش سمجھنے لگتا ہے۔ اور اُس میں افعال الاعضاء کے نقطۂ نظر سے دلچسپی لیتا ہے۔ اس لئے ہسپتال کی چہار دیواری میں نرسوں اور نوجوان ڈاکٹروں کے تعلقات پر بحث مت کرو۔ کیونکہ یہ مسئلہ خالص طبی ہے۔ جذباتی نہیں اگر وہ آپریشن کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اس ہندوستانی معمار کی طرح جو دیوار پر چند اینٹیں چننے کے بعد چلم کا ایک کش لے لیتا ہے۔ وہ بھی نرس کا بوسہ لے لیتا ہے۔ لیکن اس امر کی ذمہ داری اس پر عاید نہیں ہوتی کہ اس بوسے کی آواز سے میز پر پڑا ہوا مریض بیک چونک پڑے اور خود کو ذبیح اللہ کے گوسفند کی طرح کشتہ دیکھ کر حواس باختہ ہو جائے۔ قانون بھی ایسے ڈاکٹر کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس لئے کہ جراثیم نہ تو رات کو سوتے ہیں، نہ اتوار کو گرجا جاتے ہیں اور نہ گرمیوں کی تعطیل میں پہاڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ امتحان کر کے دیکھا گیا ہے کہ اپریشن کے وقت اگر ڈاکٹر کے پاس نرس موجود نہ ہو تو وہ عالم اضطراب میں کچھ کا کچھ کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹانکے لگاتے وقت زخم میں سے اپنے آلات تک نکالنا بھول جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی طرح اور دوسرے پیشہ ورکہ جو دن رات سخت دماغی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں ان کو نرسوں کے بجائے لیڈی ٹائپسٹ، لیڈی کلرک اور لیڈی سکریٹری کے بغیر چارہ نہیں۔

(ساقی)

صدائے بازگشت

لکھنؤ میں ہمارے ایک دوست کی شادی تھی جس میں شرکت کرنے پر ہم اس قدر مجبور ہو گئے کہ اگر ہم رحلت بھی فرما جاتے تب بھی وہ ہم کو نہ چھوڑتے ۔ اور کسی بزرگ عامل سے تعویذ لے کر فتیلہ کے ذریعہ ہماری روح کو خواہ وہ عالم بالا میں ہوتی یا عالم اسفل میں بہر حال طلب ہی کر لیتے ۔ دعوتی رقعہ کے بجائے وہ عزرائیل بن کر خود ہمارے لینے کو آئے ۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ شادی کا لطف اٹھائیں اگر اپنی نہ سہی تو دوسرے کی سہی اور اس بہانے سرزمین اودھ کے ایک مایہ ناز شہر کی زیارت بھی کر لیں ۔ مگر پس و پیش اس لئے کر رہے تھے کہ ممکن ہے ہم سے دوران قیام میں کوئی ایسی غلطی نہ سرزد نہ ہو جائے جو وہاں کی نازک طبیعتوں پر بار گزرے اور ہم دیہاتی کہلائیں ۔ مجبوراً ہم کو جانا پڑا ۔ اور خدا کا شکر کہ ہماری تہذیب لکھنوی تہذیب سے ٹکرائی نہیں ۔ رسم شادی بخیر و خوبی ختم ہو گئی اور اسی کے ساتھ ہماری مدت قیام بھی قریب الختم آ گئی ۔

مہمانی کی آخری شب تھی ۔ کیونکہ صبح کو ہمارا کوچ تھا ۔ ہمارے دوست

نے ہمارے سونے کا انتظام زنانی محلسرا کی کشادہ چھت ہی کے اوپر کرا دیا تھا۔
جہاں ان کے قریبی رشتہ دار اور عزیز پہلے سے سویا کرتے تھے پچیس تیس
پلنگوں کے بیچ میں ہمارا پلنگ اور سوئے پڑے سب بچوں اور عورتوں کے اوپر
چھت تھی۔ تمام لوگ شادی کی ہنگامہ آرائیوں میں متواتر مصروفیت کی
کی وجہ سے خستہ ہو کر جلد ہی سو گئے۔ اور اس طرح اینڈ اینڈ کر سوئے کہ سر د
پا کی خبر ہی نہ رہی۔ یہی حال ہمارا بھی ہوا۔

تقریباً دو بجے ہماری آنکھ کھل گئی۔ سارے مکان پر سناٹا تھا۔ اس طرح
کہ سکوت کا ایک سا سمندر معلوم ہوتا تھا۔ جس میں خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز کبھی کبھی بلند
ہو کر موجوں کی ایک مثال قائم کر دیتی تھی۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی تھی،
تیرہویں رات کا چاند بام آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک چمک
کر ٹھنڈے ٹھنڈے نور کی بارش کر رہا تھا۔ جس میں گرد و پیش کی سفید سفید
چادریں ایسی غائب ہو گئی تھیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک
تمام چھت خالی ہی نظر آتی تھی۔ ڈھول تاشہ، باجا، گانا اور غل پکار کے
بعد یہ قیامت خیز سکون دل پر ایسا چھایا کہ ہم کھو گئے۔

"جھکے حسب مدر جاگتے رہو" ...... نے ہمارے استغراق کو ختم کر دیا
شاید کسی رئیس کی ڈیوڑھی کے محافظ کی صدا تھی۔ جس کی دلکش بازگشت نے
ہماری عنانِ توجہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ اس کی ملائمیت، شیرینی، صحیح تلفظ

اور باقاعدہ اتار چڑھاؤ نے ہمارے دل میں ایک تزلزل پیدا کر دیا۔ تھی تو ایک معمولی چوکیدار کی آواز مگر اس خاص موقع پر سکوت شب کو توڑتی ہوئی ٹھنڈی فضا میں پھیلتی ہوئی اور چاندنی کے لطیف تاروں سے ٹکراتی ہوئی۔ میرے کانوں میں اس طرح در آئی جس طرح جلترنگ کا ساز۔

معاً میرے خیالات لکھنؤ کے گذشتہ عروج و اقبال کی طرف مڑ گئے آہ! یہ آواز اسی زمانے کی ایک یادگار رہے جو آج کل کے اجڈ اور بھدے سپاہیوں کی ڈراونی آواز سے جس کو سن کر معصوم بچے اپنے اپنے بستروں سے ایک خوفناک تڑپ کے ساتھ اچھل پڑتے ہیں کس قدر مختلف ہے۔ وہ کتنا اچھا زمانہ ہوگا جبکہ اس شہر کے ہر ہر گلی کوچے سے یہی صدائیں بلند ہوتی ہونگی۔ مغلیہ سلطنت کے سطوت و جبروت کے بعد پھر وہ زمانہ بھی غنیمت ہوگا جبکہ اس مردم خیز خطہ پر یہاں کے نازک مزاج بادشاہ اپنی آن بان کے ساتھ حکومت کرتے ہونگے۔ دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان میسور کے پہاڑوں میں اپنے شیرانہ نعروں سے اسلام کی گونج پیدا کر رہے ہونگے اور سندھ کے ریگستانوں میں وہاں کے امرا اپنی فطری سادگی اور بے تکلفی سے ہندوستان میں یثربیوں کی سادگی کی یاد دلا رہے ہونگے۔ کاش ہمارے پاس ہمارے پورے دل کے چند ٹکڑے ہی باقی رہ جاتے ...... "حکمے حیدر جاگتے رہو او..." کی آواز پھر بلند ہوئی اور فضائے لبسیط میں محور کے گرد محو رقص ہوتی ہوئی ایک ہلکی

سی گونج میں تبدیل ہو کر میرے کانوں کے پردوں پر پھر آ کر ٹکرائی اور میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی کھو گئی۔

آہ! کتنی شیریں آواز ہے۔ کاش میں ایسی آواز والا پیدا ہی ہوتا یا اسی آواز کا ریکارڈ میرے گلے میں اتر جاتا۔ کیا میں اپنی آواز میں بھی اسی طرح کا لوچ، گونج اور پاٹ پیدا کر سکتا ہوں اور کیا میں اسی طرح بعینہٖ اسی طرح آواز لگا سکتا ہوں.... ؟ یہ سوالات تھے جو میں تکیہ پر سر رکھے ہوئے اپنے دل سے کر رہا تھا۔ اس وقت میں خود فراموش تو نہ تھا البتہ کل فراموش تو ضرور تھا۔ ہاں اس وقت میری آواز کی گونج کتنا لطف دیگی؟ میں نے خیال کیا۔ کھنکھار کر اپنے گلے کو صاف کیا اور وہیں بستر پر لیٹے لیٹے سر کو ذرا اونچا کیا اور "حلّے حیدر جاگتے رہو" کی ایک بے تحاشہ آواز نکالی جو بجائے سریلی اور لچکدار ہونے کے جھنکار پیدا کرتی ہوئی مکان کی قلعہ نما دیواروں سے ٹکرا کر ایک ایک اینٹ میں لرزہ پیدا کر گئی......

آہ! یہ میں نے کیا کیا؟ میں اچھل پڑا کیونکہ ادھر آواز کا میرے مُنہ سے نکل کر پھیلنا اور اُدھر میرے قرب وجوار کے سونیوالوں کا ہڑبڑا کر "کیا ہے؟ کیا ہے؟" کہتے ہوئے بستروں پر سے کود کود کر اچھلنا اور نیچے صحن میں عورتوں اور بچوں کا یکایک بیدار ہو کر دھوکا پیدا کرنا میرے لئے سوہان روح ہو گیا۔ کاش یہ میرے مُنہ سے نکلی ہوئی آواز میرے حلق میں پھر واپس آ جاتی۔

"آخر آپ کو یہ کیا سوجھی؟....." مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ تھی۔ "اے لوگو یہ کون سی شرارت تھی کہ موئی جان کو ہلکان کر دیا۔ آخر ہیں نا دیہاتی؟" عورتیں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں..... "اچھن، بنن، اغن، ذرا دریافت تو کرو یہ ہوا کیا؟" بڑی بوڑھیاں احکام دے رہی تھیں۔ "ہے ہے کلیجہ کانپ رہا ہے باجی! اللہ ہاتھ رکھ کر دیکھئے کیسا دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔" لڑکیاں التجا کر رہی تھیں.... "امی جان! ہمیں لپٹا لیجئے ڈر لگتا ہے۔" بچے رونی آواز میں کہہ رہے تھے۔ اور "جناب آپ نے غضب کر دیا۔ میں اختلاجی مریض، کن دقتوں کے بعد سویا تھا۔ بس اب نیند کا خدا ہی حافظ ہے۔" ایک ضعیف العمر میری جان کو رو رہے تھے اور ہم سر جھکائے ہوئے۔ دل کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پلنگ کی پائنتی کی طرف منہ کئے دم بخود بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے سوالات کا بیک وقت کس طرح جواب دیتے اور اگر دینے کی کوشش بھی کرتے تو زبان کس کے منہ میں تھی؟

(ساقی)

بمبئی کے مکان!

ہم ٹرین سے اترتے ہی سیدھے وہاں پہونچے جہاں ہمارے ایک دوست رہتے تھے۔ بعد تلاش بسیار جب ان کی جائے قیام کا پتہ مل گیا تو ہم اُس بلڈنگ میں داخل ہوئے اور زینے پر چڑھنے لگے۔ قطب مینار ہم ایک بار دیکھ آئے تھے اور جوشِ عمل میں سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے اس کے عرشہ تک بھی پہونچ گئے تھے۔ لیکن اترتے وقت زمین ہم کو اس سرعت کے ساتھ کھینچ رہی تھی کہ ہم تیزی رفتار کے لحاظ سے بجلی ہوئی ہوائی معلوم ہوتے تھے ——
جی ہاں! اس وقت زینہ کی چڑھائی نے ہم کو قطب مینار کی یاد دلادی اور اس گھماؤ اور پھراؤ نے آصف الدولہ کے امام باڑہ کی بھول بھلیوں کو۔

رات کا وقت تھا۔ گردوپیش کے تمام کمروں میں بجلی کی بتیاں روشن تھیں معززاور شریف عورتیں اپنے اپنے کاموں میں اور بچے اپنے کمروں کے سامنے اپنی معصوم تفریحوں میں مشغول تھے۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں اس شخص کی حیرت کی انتہا کہ جو ایسے مقام سے آرہا تھا جہاں کے مکانوں کی دنیا ہی بالکل علیحدہ ہے۔ جہاں ایک اجنبی کے لئے مکان کے اندر کا سین دیکھ لینا ناممکن ہے

بشرطیکہ وہ چور، پولیس اور مہمان نہ ہو۔ سڑک پر چلنے والوں کے لئے گرد وپیش کی دیواریں حد نظر ہو جاتی ہیں اور مکان کے اندر رہنے والوں کی دنیا صحن اور کمروں میں محدود ہو جاتی ہے۔ البتہ کشادہ صحن، تازہ ہوا اور سورج کی روشنی ہر مکان کی ساخت کے مطابق بلا شرکت غیرے قبضہ رہتا ہے اور فضا میں ہمسایہ کی آنکھ اور کان کو دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔

ہم کو کیا معلوم تھا کہ یہ چند منزل کی عمارت جس میں سینکڑوں کمرے ہیں ان میں سینکڑوں خاندان بھی فروکش ہیں اور ان کے اترنے اور چڑھنے کا زینہ بھی ایک ہی ہے۔ ہم نے اپنے روایتی اصول کے مطابق کہ پردہ دار کو دیکھتے ہی یا تو فوراً گھوم جائیے اور یا آنکھوں پر رومال، ہاتھ، ٹوپی وغیرہ کی اوٹ کر لیجئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا تاکہ ہم سوائے زینہ کی سیڑھیوں کے اور کچھ دیکھ ہی نہ سکیں۔ مگر اس کے باوجود ہمارے دل میں جھجک پیدا ہو رہی تھی اور دماغ میں شکوک۔ خیال یہ تھا کہ یہ مخصوص طریقے سے زنانے مکان ہیں اور یہ زینہ بھی عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شاید ہمارے دوست تک پہنچنے کا دوسرا راستہ ہو جس کا ہم کو علم نہ ہو، یا ممکن ہے کہ کسی ذات شریف نے اجنبی خیال کر کے مذاق کیا ہو اور یہ غلط راستہ بتا دیا ہو، ایسا نہ ہو کہ پردیس میں ذلت ہو اور "اس موئے کو نکالو، کہاں گھسا آتا ہے" کی صداؤں سے پسپا ہونا پڑے۔

بہر حال چونکہ دو منزلیں طے کر آئے تھے اور اسی دوران میں کوئی ناگوار واقعہ بھی ظہور پذیر نہیں ہوا تھا اس لئے ہمت کر کے آگے بڑھے ہی گئے۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ "آئز فرنٹ" ہی رہیں۔ مگر تیسری منزل پر پہنچنے کے بعد ہم نے خود کو یکایک ایسی جگہ پایا جہاں قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں کی ایک بڑی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔ کیونکہ کمروں کے باہر فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی مختلف کیفیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ دنیا کی تمام چیزیں تماشہ کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن برات۔ جنازہ۔ مار پیٹ۔ پاگل اور بندر مخصوص طریقے سے تماشہ ہیں مگر جس قدر ایک اجنبی میں تماشہ بننے کی صلاحیت موجود ہے اتنی کسی اور ہستی میں نہیں۔ دوسرے ملک اور شہر میں جا کر وہ ایک عجیب الخلقت انسان بن جاتا ہے۔ میں خود کو ایسی حالت میں پا کر ارادۃً ایک پنواڑی کی دوکان کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرتا تھا تاکہ معلوم کروں کہ میری ناک سونڈ تو نہیں بن رہی ہے۔

چنانچہ میں اس وقت اس عمارت کی تیسری منزل پر ایک متحرک تماشہ تھا جو حاضرین کو بلا ٹکٹ دکھایا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فلم کی سی سرعت کے ساتھ زینے کی سیڑھیوں کو طے کر رہا تھا تاکہ یہ سین طویل نہ ہو جائے اب بد قسمتی کو کیا کیا جائے کہ جس طرح پردہ سینما پر فلم کو یکبارگی ایک حادثہ

پیش آجاتا ہے۔ اسی طرح مجھکو بھی ایک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ میری قوت رفتار سلب ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ آٹھ عورتیں زری کے لباس میں ملبوس ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چوتھی منزل کے زینہ سے تیسری منزل پر آرہی تھیں اور میں تیسری منزل سے چوتھی منزل پر جارہا تھا۔ ان کا اور میرا جس وقت مقابلہ ہوا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ ایک نوجوان جس کی پرورش و پرداخت حرم کی طرح سب سے علیحدہ ہوئی ہو اس وقت سولہ آنکھوں کا رخ اپنے ہی چہرے کے نقطے پر جما ہوا دیکھکر کس طرح نہ گھبرا جاتا۔ خود ہی میرا منہ مڑ گیا۔ پیر تیز ہوگئے اور بجائے چوتھی منزل پر جانے کے میں تیسری منزل سے دوسری منزل کی طرف چلا جارہا تھا۔ میرے کانوں میں سات آٹھ سُروں سے ملے ہوئے ایک لطیف قہقہے کی آواز آرہی تھی، مگر میں اترتا ہی جارہا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اس گھبراہٹ میں میں تیزی سے اُتر رہا تھا اور ایک دوسرے صاحب تیزی سے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ ریل گاڑی کے انجنوں کی طرح میں اور وہ ٹکرائے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دھڑام سے گرے اور فٹ بال کی طرح گدے کھاتے ہوئے پہلی منزل کے زینے پر بمشکل آکر رُکے۔

جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو میرے تعجب کی کوئی انتہا

نہ رہی جب میں نے انھیں دوست کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا جن کی تلاش مجھے سب مقصود تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے اسی طرف پھر واپس لئے جا رہے تھے جہاں سے میں ایسی سراسیمگی میں بھاگا تھا۔

(اختتام)

دیاسلائیوں کا قحط

اگر آپ تاروں کو شمار کر سکتے ہیں تو دیاسلائیوں کا شمار بھی ممکن ہے اور اگر دیاسلائی کی ڈبیوں کے ٹریڈ مارک جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے پورا محکمہ قایم کرنا پڑیگا۔ لندن میوزیم کی طرح اس کی فہرست ایک بہت بڑی قاموس بن جائیگی جو عجائب المخلوقات سے کسی طرح کم نہ ثابت ہوگی۔

ایک زمانہ تھا جبکہ دیاسلائی بہت حقیر سی شے تھی۔ میں جس بے تکلفی سے سانس لیتا ہوں اسی بے تکلفی سے دیاسلائیاں بھی جلا سکتا تھا۔ کیونکہ ہوا کی طرح یہ بھی سارے عالم پر چھائی ہوئی تھیں۔ فرض کیجئے کہ ہمیں سگریٹ سلگانا ہوتی تو ہم ایک دیاسلائی اس لاپروائی سے روشن کرتے تھے کہ وہ فوراً بھڑک کر بجھ جاتی تھی۔ اس کے بعد ہم دوسری کوشش کرتے تھے۔ اور جلتی ہوئی دیاسلائی کو سگریٹ کے پاس لانا ہی چاہتے تھے کہ فوراً ہمارے قریب بیٹھے ہوئے دوست کے سر پر شیطان سوار ہو جاتا تھا اور وہ اس شعلہ پر اپنے تنفس کی قوت کو آزمانے کے لئے بس ایک ہلکی سی پھونک مار بیٹھتے تھے اور وہ دیاسلائی بجھ جاتی تھی۔ ہم کو بھی ضد آجاتی تھی۔ ہم جلانے کی کوشش

کرتے تھے اور وہ پھونکنے کی۔ یہاں تک کہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے اکثر اوقات سگریٹ سلگانے کے مقابلے بھی منعقد کئے جاتے تھے۔ بالکل بٹیروں تیتروں اور مرغوں کے مقابلوں کی طرح یہ مقابلے خاص طور سے ایسی موٹر پر بیٹھکر کئے جاتے تھے جس کا عرفہ (ہڈ) گرا ہوا ہوتا تھا اور وہ تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہوتی تھی۔ حسرت رہ گئی کہ ہوائی جہاز کے عرشہ پر یہ مقابلہ منعقد نہیں کیا جا سکا۔

دیا سلائیوں کی ہوائیاں چھوڑنا بھی لطف سے خالی نہ تھا۔ دیا سلائی کا سر اس کے بکس پر چسپاں شدہ ریت کا غذ پر رکھا اور انگوٹھے سے آہستہ سے دبا کر تیر کی طرح چھوڑ دیا۔ دیا سلائی ہنومان کی دم کی طرح جلتی ہوئی دور جا کر گرتی تھی۔ اور اگر رات کا وقت ہوتا تھا تو بالکل ٹوٹتا ہوا تارہ معلوم ہوتی تھی۔

دیا سلائیوں کے معاملے میں میری یہ فضول خرچی ایسی تھی کہ گویا تمام دنیا ان سے بھری ہوئی ہے اور میں ان کو جلا کر دوسری چیزوں کے لئے جگہ پیدا کر رہا ہوں کیونکہ ایک پیسے میں اکثر دو بکس مل جانا کوئی بات ہی نہ تھی۔ اگر اتفاق سے جیب دیا سلائی سے خالی اور سگریٹ سے بھری ہوتی تھی تو اس کو خریدنا معیوب تھا۔ ہم کسی راہگیر سے اس کا بکس اس بے تکلفی سے مانگ سکتے تھے کہ جس طرح اس سے وقت پوچھ سکتے تھے۔ اس زمانے کے راہگیر بھی اس

قدر بیر چشم ہوتے تھے کہ پورا بکس ہم کو سپرد کرکے "تو دانی حساب کم و بیش را" کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ اگر ہم نے پہلی ہی کوشش میں سگریٹ سلگالی تو فبہا ورنہ دوسری کوشش کے نتیجہ کا انتظار کئے بغیر وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے تھے اور وہ بکس مال غنیمت کی طرح ہمارے حصہ میں آجاتا تھا۔

میں کثیر الاحباب ہوں اور اسی لئے جب میں مکان واپس آتا تھا تو میری جیبوں سے دیا سلائیوں کی ڈبیاں برآمد ہوتی تھیں۔ معاف کیجئے اس مقام پر آپ میری نیت پر حملہ نہ کیجئے گا۔ دراصل واقعہ یوں ہے کہ خالی ہاتھوں اور چلتی ہوئی زبان کے لئے دیا سلائی کا بکس بہترین ساز کا کام دیتا ہے بشرطیکہ خالی نہ ہو۔ جس وقت آپ اپنے دوست سے رخصت طلب کرتے ہیں اس وقت ہاتھوں کو مصافحہ کے واسطے تیار کرنے کے لئے آپ ان کو غیر ارادی طور سے اپنی کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر نکال لیتے ہیں۔ کمبخت ڈبیا وہیں رہ جاتی ہے لیکن اگر آپ یہ خیال فرمائیں کہ اس طرح حاصل شدہ ڈبیوں سے آپ کے باورچی خانے کے بجٹ میں کچھ کمی آجاتی ہو تو غلط ہے کیونکہ اس ہاتھ لینا اور اس ہاتھ دینا کے اصول پر وہ بیوفا ڈبیاں آج میری جیب میں مفرور ہو کر چلی آئیں تو کل شرطیہ میرے دوستوں کے ساتھ چلی جائینگی۔

اس زمانے میں کہ جس کا ہم مرثیہ پڑھ رہے ہیں ڈبیاں جنگلی سائز کی ہوتی تھیں۔ مخصوص طریقے سے سوئیڈن کی ڈبیاں مارواڑی کی تھیلی کی طرح،

گھری ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ دیاسلائیوں میں اس قدر برکت ہوتی تھی کہ ایک ڈبیہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی حالانکہ دیاسلائی ہم پہلے جلاتے تھے اور بات پیچھے کرتے تھے۔ مخصوص طریقے سے ہماری مامائیں باورچی خانے میں کپیاں جلاتی تھیں اور صحن کی طویل منزل طے کرنے کے لئے ان سے مشعل راہ کا کام لیتی تھیں اور خوفناک گوشوں میں جانے کے وقت طلسمی فتیلوں کا کہ جن کی روشنی اور دھویں سے بھوت ہوا ہو جاتے تھے۔ یہ کپیاں مچھروں کی طرح ہوا کے سامنے مشکل سے ٹھہرتی تھیں اس لئے راستہ بھر ان کا وظیفہ مسجد کا چراغ گل نہ ہونا رہتا تھا۔ لیکن مسجد کا چراغ گل ہو جاتا تھا اور اس تمام مہم میں نہ معلوم کتنی دیاسلائیاں جلا دی جاتی تھیں۔

اب چند دن سے دیاسلائیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ آج کل ڈبیاں اس قدر دبلی پتلی ہوتی ہیں کہ پرانے زمانے کے بکسوں کے مقابلے میں اچھی کیس معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں دیاسلائیوں کی تعداد بھی گنی چنی رہ گئی ہے جس طرح قیامت کے زمانے میں مومنوں کی تعداد گھٹ کر چالیس رہ جائیگی اسی طرح آج کل ایک ڈبیہ میں صرف چالیس ہی دیاسلائیاں باقی رہ گئی ہیں گویا ان کی آبادی میں قیامت آچکی۔ اول الذکر کی توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے قیامت کے قریب مومنوں میں ضبط تولید کی تحریک شروع ہو جائے لیکن آخر الذکر کی کمی کا سبب یہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جس طرح کارڈ اور لفافے مہنگے ہو جانے کی وجہ سے حلقۂ احباب میں تخفیف کرنی پڑی تھی اسی طرح دیا سلائیوں کے قحط کی وجہ سے سگریٹ کی تعداد میں تخفیف کرنی پڑی ہے۔ مخصوص طریقے سے بیڑی پینے والے حضرات قابل رحم ہیں کیونکہ بیڑی کو جلتا رکھنے کے لئے دیا سلائیاں مسلسل سلگائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پینے والے کے ایک ہاتھ میں سلگی ہوئی بیڑی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دراصل بیڑی پیتا ہے یا دیا سلائی، یا بیک وقت دونوں کا دم لگاتا ہے۔

فی زمانہ راستہ میں لوگوں سے ہمدردی اور دیا سلائی کی امید رکھنا بیکار ہے۔ دیا سلائی طلب کرنا بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ہاتھ پھیلا کر پیسہ مانگنا، اور اس کا دیدینا بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے اپنی عزت کا دینا۔ بعض اوقات جب میری سائیکل کی بتی گل ہو جاتی ہے اور بدقسمتی سے دیا سلائی کی ڈبیا اور کیسہ دونوں خالی نظر آتے ہیں اس وقت مجھے اگلے زمانے کی یاد خون کے آنسو رلاتی ہے کیونکہ ہر چوراہے پر پولیس کا سپاہی قانون کا مجسمہ نظر آتا ہے اور ہر راہرو دیا سلائی کے معاملے میں یہودی ثابت ہوتا ہے۔

یہ تو خیر سڑک کا معاملہ ہے۔ لیکن خود اپنے محلہ میں جب کبھی مجھکو دیا سلائی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں جس کسی سے سیدھے سادے طریقے سے طلب کرتا ہوں وہ منہ بنا کر رہ جاتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں

جو میرے قریب ہی رہتے ہیں ان سے دیاسلائی مانگنے کے لئے مجھے بہت حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں پہلے دیاسلائی کی تمہید اٹھاتا ہوں اور وہ اس طرح کہ اٹلی اور حبشہ کی جنگ کا قصہ چھیڑ کر اٹلی کی طرفداری کرتا ہوں تاکہ میرے مارواڑی دوست اپنی اہمیت محسوس کر لیں۔ اور ان کی رائے کی وقعت ہو جائے۔ اس کے بعد میں سگریٹ نکالتا ہوں اور وہ مسکرا کر دیاسلائی۔ کیونکہ وہ اب جان گئے ہیں کہ مجھے ان کی باتوں سے زیادہ ان کی دیاسلائی سے دلچسپی ہے۔ لیکن وہ ایسی قیمتی شے میرے ہاتھ میں نہیں دیتے بلکہ پہلے وہ چاروں طرف سے کمرہ بند کر دیتے ہیں تاکہ دوسری دیاسلائی جلانے کی نوبت نہ آئے۔

محلے میں آج کل جو شخص پہلے آگ سلگا لیتا ہے اس کی جان عذاب میں آجاتی ہے کیونکہ تمام محلے والے اس کے چولھے پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور گوری کے جوبن کی طرح اس کی چنگاریوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ محفلوں میں جو شخص سگریٹ ختم کر لیتا ہے وہ اس کے ٹکڑے کو ضایع نہیں کرتا بلکہ اس کو چنگاری کی شکل میں محفوظ رکھتا ہے تاکہ دوسرے سگریٹوں کے کام آسکے بڑے بڑے ہوٹلوں میں اب دیاسلائی کے بجائے جاپانی لمپ جلتے ہیں اور چھوٹے ہوٹلوں میں مونجھ کی رسیاں۔ بہرحال دیاسلائی کے قحط نے جاپان کی تجارت کو فروغ دیدیا ہے۔

میونسپلٹی سے التجا ہے کہ وہ پانی کے نل اور پارکوں کی طرح جگہ بجگہ آتشدان بھی بنوا دے تاکہ ہم لوگ دیاسلائی کے اس قحط سے امان پائیں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہولی کا تہوار بجائے تین دن تک رہنے کے سال بھر برابر جاری رہے اور سڑکوں کے چوراہوں پر دن رات آتشیں مظاہرے ہوتے رہیں۔ ہاں ایسے موقع پر ایک قیمتی مشورہ اور بھی دیا سکتا ہے۔ ہندوستان میں رفتہ رفتہ تمام مذاہب تبلیغی ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پارسی اس فرض سے اب تک شان استغنا برت رہے ہیں۔ اپنی سیاسی کثرت بڑھانے کے لئے اس زمانے سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا ہے جبکہ دیاسلائی کا قحط ہے کیوں نہیں وہ ہر جگہ آتشخانے بنوا کر اگنی ماتا کا پرچار کرتے؟

(ادبی دنیا)

نگہبان!

سڑک پر اللہ اکبر کے نعروں کی آواز ایک ہوا کے طوفان کی طرح اٹھی جس نے دو رویہ عمارتوں کی لاتعداد کھڑکیوں کے پردوں کو اس طرح الٹ دیا جس طرح آسمان پر آئی ہوئی کالی کالی گھٹا ہوا کے زور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غایب ہو جاتی ہے اور آسمان کا مطلع کھلا چھوڑ جاتی ہے۔ پردوں کے ہٹنے کے بعد بجلی کے قمقموں کی روشنی میں بہت سے چہرے نکلے اور عمارتوں کے آسمانوں پر چاند ہو کر چمکے لاتعداد تیز سیاہ اور چمکدار آنکھیں تھیں جو برقعوں، چادروں اور دوپٹوں میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ سامنے کے کھلے ہوئے زینوں میں اوپر سے اترتے ہوئے چہروں اور جسموں کے باصرہ نواز مجموعے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آسمان پر ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح اپنی برق پاشیوں سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ ان ستاروں کی روشنی گھٹتے گھٹتے ایک نقطہ پر آ کر تاریکی میں غایب ہو جاتی ہے اور ان ستاروں کی روشنی بڑھتے بڑھتے سامنے آ کر ٹھہر گئی تھی۔

جلوس میں کچھ ایسے لوگ تھے جو فوج کے بہادر سپاہیوں کی طرح اپنے

سرزاویہ قائمہ پر رکھے ہوئے آنکھوں کو اپنے سامنے والی سڑک کے بالکل متوازی قائم کیئے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو گھومتے ہوئے کیمرے کی طرح جلوس کی سرخ جھنڈیوں پر نگاہ ٹھہراتے ہوئے اللہ اکبر کہتے ہوئے گردو پیش کے لوگوں پر ہلکی سی نظر ڈالتے ہوئے اور اپنے رخ کو خوبصورتی سے قریب کی سمت کی طرف موڑ کے نازنگاہ کو اونچا نیچا کر کے ایک نقطہ پر لا کر ٹھہرا دیتے تھے۔ اس طرح سے ان خاص خاص تصویروں کو اپنی ذہنی فلم پر منتقل کر کے وہ مجبوری اپنے چہرہ کو پھر بکتہ اول پر لے آتے تھے اور قدم آگے بڑھاتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جن کے زاویہ نگاہ کا پتہ چلانا ذرا مشکل کام تھا۔ ظاہر بین نظروں کے لئے ان کے سر کا زاویہ قائمہ بالکل اتنے ہی درجہ کا تھا جیسا کہ قسم اول کے بہادر سپاہیوں کا لیکن ان کی آنکھوں میں ذرا فرق تھا۔ ان کے گوشہائے چشم ایک ہی سمت کو کھنچکر ذرا لمبے ہو گئے تھے اور آنکھوں کے ڈھیلے بجائے بیچ میں رہنے کے ڈھلک کر انھیں کھینچے ہوئے گوشہائے چشم میں آکر اس طرح چھپ کر سمت مطلوبہ کی طرف جھانک رہے تھے کہ اگر کوئی دوسری طرف سے دیکھتا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی ہی نظر آتی۔

ہم لوگ چاروں طرف دیکھتے چل رہے تھے۔ امریکن اور یورپین سیاح جو ہندوستان میں سیر کے لئے آتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں واپس جا کر ہندوستانی عورتوں کے پردے کی بڑی شکایت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے کے

پتھروں تک کا معاینہ وہ کر کے جاتے ہیں لیکن یہاں کے حرم کی دیواروں میں نہ تو کوئی روزن کر سکتے ہیں اور نہ یہاں کی حوا کی بیٹیوں کے چہروں پر نگاہ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی شکایت بالکل بیجا ہے بہت ہی معمولی ترکیب ہے جب کسی گلی یا سڑک سے گزریں اپنے ساتھ دو تین بیگ پائپ اور ایک ڈھول تاشے بجواتے ہوئے چلیں۔ ان سروں میں ایسی تاثیر ہے کہ ناگ اور ناگنوں کی طرح یہ آدم اور حوا کی اولادیں سب بے تحاشہ حجاب حرم سے نکل کر محو تماشہ ہو جائینگی۔

خیر میں اسی خیال میں تھا کہ یکایک ہاشم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا۔ "دیکھو ادھر!"

میرے نگاہ موڑنے سے قبل سلیم کی نگاہیں اس طرف مڑ چکی تھیں میں نے تیسری منزل پر ایک شکل دیکھی جو واقعی قابل پرستش تھی۔ ہاشم نے اس کو نگاہ بھر کے دیکھا اس کی تعریف کے پل باندھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہیں کھڑے ہو گئے سلیم باوجود اس قدر زندہ دل ہونے کے بالکل نہ رکے اور سر نیچا کئے ہوئے آگے بڑھے گئے۔ ہاشم نے آگے بڑھکر روکا ان کو اس بیچ بے اور برف صفتی پر برا بھلا کہا اور اپنے انتخاب پر داد کے طلبگار ہوئے۔ ہاشم اشارہ کر کر کے ان کو بتا رہا تھا مگر سلیم شرمایا جاتا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑا جاتا تھا۔

"دیکھو وہ ہم لوگوں کو دیکھ بھی رہی ہے" ہاشم نے کہا

اور واقعی اس کی نظروں کا رُخ ہم ہی لوگوں کی طرف تھا۔ زیادہ رجحان سلیم کی طرف معلوم ہوتا تھا۔ ہم لوگ سلیم سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ ادھر سے کسی نے آواز دی "بھائیجان" مڑ کر جو دیکھتے ہیں تو اس لڑکی کا تو کہیں پتہ نہیں لیکن اس لڑکی کی جگہ سلیم کا بھائی حسن سلیم کھڑا ہوا اپنے بھائی کو بلا رہا تھا۔

"ارے یہ تمھارا گھر ہے؟" ..... میں نے شرمندہ ہو کر سلیم سے کہا۔ ہاشم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ سلیم کے گلے میں باہیں ڈال کر معافی مانگنے لگا۔ سلیم بناوٹی ہنسی ہنسا۔ سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اپنی ندامت مٹانے کو ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے زینے کی طرف لے چلا۔

"چلو چائے پئیں گے!"

چائے پی رہے تھے لیکن ہم لوگ اس واقعہ کی ندامت میں خاموش ہی رہے جب کبھی ہماری نظریں سلیم سے دوچار ہو جاتی تھیں تو وہ بھی شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتا تھا اور ہم لوگ بھی آخر ہاشم سے نہ رہا گیا اور اس نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ تمھاری کوئی عزیز تھیں؟"

"ہاں، میری بہن تھی" سلیم نے بناوٹی قہقہہ لگا کر کہا۔ اس کے بعد کہا "جانے بھی دو اس کا خیال، خود میرے ہی اوپر ایک واقعہ گذرا ہے۔"

ندامت کی آہنی دیواریں ٹوٹ چکی تھیں اس لئے ہم نے ان سے فرمائش کی کہ ہم آپ کا واقعہ ضرور سنیں گے کہنے لگے کہ جب آنکھوں کے سامنے کوئی چیز آئے تو لامحالہ دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ دماغ میں خیالات کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے لیکن ارادتاً گھورنا۔ آوازے کسنا۔ اشارے کرنا اور ہر چیز کے تعاقب میں چلنا بدنفسی کی دلالت ہے۔"

میں نے ہاشم کی طرف دیکھا اس کا ماتھا شرمندگی کے پسینے سے تر تھا۔

"خیر میری بھی یہی حالت تھی" سلیم نے کہا۔ "مگر اب نہیں ہے۔ کب سے نہیں ہے اسے دو سال ہوئے۔ میری شادی تم جانتے ہی ہو کہ شمالی ہند میں ہوئی ہے وہاں عورتوں کا بہت سخت پردہ ہے۔ بند سواریوں میں گھر سے نکلتی ہیں۔ عام رواج ڈولیوں کا ہے۔ ایک مرتبہ میں اپنی سسرال گیا اور وہاں ایک عزیز سے مل کر واپس آ رہا تھا کہ سامنے سے میں نے ایک ڈولی آتے ہوئے دیکھی۔ میں اس کے قریب ہی پہونچا تھا کہ وہ سڑک کے داہنی طرف مڑنے لگی۔ سامنے والے کہار کے مڑنے پر ڈولی کا اگلا رخ بالکل میری نظر کے سامنے آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ پردے کے دونوں پرتوں کو ملا کر بیچ میں سے مضبوط پکڑ لیا گیا تھا۔ مگر دو حنائی انگلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے پردے میں ذرا سا شگاف ہو گیا تھا۔ بس اسی شگاف میں سے میں نے دو آنکھوں اور چہرے کے کچھ حصے کو دیکھا۔ آنکھیں تھیں یا واقعی موتی تھے جن کی چمک اور کشش سے میں بیتاب ہو گیا۔ ادھر

میرے منہ سے بے اختیار "اُف" نکلا۔ ادھر اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں اور چشم زدن میں دونوں پردے بیچ میں آکر اس طرح مل گئے گویا پہلے ہی سے یونہی ملے ہوئے تھے۔ ڈولی مڑ چکی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈولی کا تعاقب کرونگا بس اسی دھن میں ڈولی کے کبھی پیچھے پیچھے چلتا تھا اور کبھی آگے جاکر اس امید میں ٹھہرتا تھا کہ پھر پردہ کھلے اور مجھے باز دید کا موقع ملے مگر پردہ تو نہ کھلنا تھا اور نہ کھلا۔ میں آہستہ سے کبھی گنگناتا تھا اور کبھی زیر لب "پردہ کھولو" کہتا تھا۔ مگر پردے کو جنبش تک نہ ہوئی۔ کہار مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر میں ساتھ ہی ساتھ چل رہا تھا۔ ڈولی نامعلوم کوچوں اور گلیوں میں سے ہوتی ہوئی یکایک ایسی سڑک پر آگئی جو میرے مکان کے بالکل قریب تھی۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ اس کا رخ میرے ہی مکان کی طرف تھا۔ اب میں نے خیال کیا کہ میرا بھانڈا پھوٹا۔ کہاروں نے ڈولی میری سسرال کی ڈیوڑھی میں رکھدی اور پکار کر کہا "سواری آئی ہے اتروالو۔"

میں منہ پھیر کر باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ سواری اتر گئی اور کہار خالی ڈولی باہر واپس لے آئے۔ مگر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ آواز دوں۔ اندر سے ماما کہاروں کے پیسے لیکر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "دولھا میاں کب سے کھڑے ہیں؟"

"ابھی آیا ہوں۔" میں نے بدقت جواب دیا۔ "کیا مہمان آئے ہیں؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اندر سے آواز آئی۔ " دولھا میاں آپ کو اندر بلاتی ہیں۔ وہ پھر وہاں آئی۔ یہ سن کر مجھ پر مصیبت پڑی۔ میں نے کہا " مہمانوں کو تکلیف ہوگی۔ میں ماموں جان کے یہاں جاتا ہوں " یہ کہہ کر میں بڑھا ہی تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی صاحب " دولھا بھائی، دولھا بھائی " پکارتے آئے اور مجھے اندر لے گئے۔

" یہ دیکھو تمھاری نئی سالی ہیں۔ تمھیں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا " میری خوشدامن صاحبہ نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس طرف میں نے دیکھا تو وہی آنکھیں تھیں۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ادھر اس نے آنکھیں نیچی کر کے سلام کیا۔ میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ نہ معلوم میں نے کیا جواب دیا۔ بہرحال میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا اپنے اوپر ملامت کر رہا تھا۔

(نیرنگ خیال)

تکلیف

میرے ایک دوست پر ذیل کا واقعہ گذرا ہے جو انھیں کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔

تمہید

ہم کہیں مہمان جاتے ہیں تو تکلف کے مارے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے اگر زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ہوا تو اس کمی کو مختلف ہوٹلوں اور دکانوں میں پورا کرنا پڑتا ہے۔ بیچاری عورتیں چونکہ مجبور محض ہیں۔ اس لئے وہ خوردن برائے زیستن کا وظیفہ پڑھتی رہتی ہیں اور شکم سیر ہو کر کھانے کی غلطی کبھی نہیں کرتیں۔ مصنوعی تکلفات شکر ہے کہ سوسائٹی سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ابھی اس ضمن میں ایک بہت بڑا مرحلہ باقی ہے اور وہ نئی دلھن کے تکلف سے تعلق رکھتا ہے دراصل اس میں فطری حیا و شرم کا ہاتھ بھی ہے۔ لیکن تصنع کا حصہ زیادہ ہے یہ مشاہدہ ہے کہ دلھنوں کو بھی بھوک لگتی ہے لیکن وہ ستیہ گرہ کرنے کی ایسی عادی ہیں کہ سسرال کے دوران قیام میں چوبیس گھنٹے کا کم و بیش روزہ رکھتی ہیں جو کھانا کھا کر افطار نہیں کیا جاتا بلکہ صرف دیکھ کر، سونگھ کر اور چکھ کر۔

سچ پوچھئے تو یہ ذاتی معاملہ ہے اور اس پر کسی کو قلم اٹھانے کا حق بھی نہیں ہے لیکن چونکہ مجھکو اپنے دوست سے ہمدردی ہے اس لئے یہ چند جملے تحریر کئے گئے۔ اس کے بعد روئداد ندامت ہے۔

واقعہ

یہ ہے کہ میں اپنی بہن کا چھوٹا بھائی ہوں اس لئے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی تھی کہ ان کی سسرال کا جو ایک ہی شہر کے دوسرے محلہ میں واقع تھی روزانہ چکر لگاؤں۔ اور چونکہ میں خالی ہاتھ نہیں جا سکتا تھا اور میری والدہ اپنی محبت کا عملی ثبوت بھی دینا چاہتی تھیں اس لئے مختلف سوغاتوں اور تحفوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس امر کا ذکر بے موقع ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس کا نفس واقعہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

ایمان کی بات کہنا چاہئے۔ میری ہمشیر کی ساس نندیں ان کو بے تکلفی سے کھانا کھلانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن کامیاب نہ ہوتی تھیں چونکہ میں ابھی کم عمر تھا اور زنانے مکان میں جاتا بھی تھا اس لئے ان لوگوں نے ایک روز مجھ سے اس امر کا تذکرہ بھی کیا اور اسی کے ساتھ مجھ سے فرمائش بھی کی کہ میں اپنے مکان سے لائی ہوئی سوغاتوں میں سے کچھ تو انھیں کھلاؤں۔ میں نے ان کو ممنون کرنے کے لئے وعدہ کر لیا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں صرف چکھانے کی حد تک کامیاب ہو گیا لیکن کھلانے کی کوشش میں ناکام رہا

انھوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ میں کیا کروں میرے منہ میں کھانا چلتا ہی نہیں،

جب میں اپنے مکان پر واپس آتا تھا تو والدہ مجھ سے ان کی خیریت مزاج پوچھتی تھیں اور اس کے بعد ان کی غذا اور تندرستی کے اہم مضمون پر ہزار ہا سوالات کر ڈالتی تھیں جب میں ان کے سوالات کا صاف صاف جواب دیتا تھا تو وہ ملول اور رنجیدہ ہو کر سر جھکا لیتی تھیں۔ آخر ماں تھیں۔

لڑکی شادی ہو جانے پر پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کا اب زور تو تھا نہیں کہ جس وقت جی چاہے بلا لیں اس لئے انھوں نے مجبور ہو کر مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ لڑکی سسرال میں بھی رہے تکلف پر بھی قائم رہے اور شکم سیر ہو کر کھانا بھی کھائے۔ ایسی کوئی ترکیب ہے؟

میں نے جواب دیا کہ بندہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے حاضر ہے۔ حالانکہ یہ معاملہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بہر حال میں یہ کسی طرح نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بھوکی رہیں اور ہم لوگ شکم سیر ہو کر کھانا کھائیں۔ یہ سن کر میری والدہ بہت خوش ہوئیں اور دوسرے دن انھوں نے میری ہدایات کے موافق دو پراٹھے اور تلی ہوئی مچھلی کے دو تین ٹکڑے ایک کاغذ میں باندھ کر دیئے جن کو میں نے اپنے رومال میں لپیٹ کر نوٹوں کی گڈی کی طرح اپنی کوٹ کے جیب میں احتیاط سے رکھ لیا اور حسب دستور مختلف سوغاتوں کو ماما کے سر پر

رکھوا کر اپنی بہن کے یہاں روانہ ہو گیا۔

ان کے مکان میں پہونچکر ماما معہ سینی وخوان پوش کے ان کی ساس کے قریب پہونچی۔ اور میں معہ پراٹھوں کے بنڈل کے اپنی بہن کے کمرے میں، وہاں میں نے دیکھا کہ لڑکیوں اور عورتوں کی ایک لامحدود تعداد ان کے چاروں طرف حلقہ بندی کئے ہوئے ہے۔ میں بھی ایک کونے میں جاکر بیٹھ گیا۔ مگر مطلع صاف نہ ہوا۔ وہ لوگ اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ جب میری ہمشیر مجھ سے بات کرنے کو گھونگھٹ ہٹائینگی تو ان کو زیارت کرنے کا موقع ملیگا۔ مگر انھوں نے گھونگھٹ کھولا ہی نہیں۔ جب وہ سب بیٹھے بیٹھے مایوس ہو گئیں تو انھوں نے دوسری چال چلی۔

"بھئی اب چلو۔" کہہ کر وہ اس طرح اٹھیں گویا اس کمرے سے باہر جارہی ہیں مگر چند قدم چل کر میز کر رہی اور دروازے کی کمین گاہوں میں دم سادھ کر بیٹھ گئیں اور اشاروں ہی اشاروں میں مجھ سے اس راز کو محفوظ رکھنے کی درخواست کرنے لگیں۔ میں نے ان کی اس بیگناہ تفریح میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اس لئے اپنی ہمشیر کی اس طرح مزاج پرسی کرنے لگا گویا اب گھونگھٹ کی ضرورت نہیں ہے مگر اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اور بدستور بیٹھی رہیں۔ آخر وہ لوگ ناکام ہو کر قہقہے لگاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میری بہن نے گھونگھٹ الٹ دیا۔

وہ مجھ سے والدہ کی تندرستی کے متعلق کچھ سوالات کر رہی تھیں اور میں ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ یکایک سامنے کے دروازے میں سے وہی غول پھر نمودار ہوا اور ان کو اس طرح براگندہ نقاب بیٹھے دیکھ کر ان میں سے کسی نے خوشی سے تالیاں بجائیں، کسی نے کلکاریاں ماریں اور کسی نے تمسخرانہ انداز میں جھک کر سلام کیا۔ میں بھی ان کے قہقہوں میں شریک ہو گیا۔ باجی نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی گھونگھٹ میں غوطہ مارا۔ اچھی خاصی آنکھ مچولی تھی۔ غرضکہ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ وہ لوگ باہر جاتے تھے اور پھر بم کے گولوں کی طرح اندر چلے آتے تھے۔ میں اس بلا سے خلاصی پانے کی ترکیب بہت دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس وقت کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ راہ چارہ یہی تھی کہ اٹھ کر دروازہ بند کر دوں۔ مگر میں اس پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے ہماری عقدہ کشائی اس طرح ہوئی کہ شادی کا گھر تھا۔ بچوں کی ایک فوج تھی جو مختلف کرتبوں میں مشغول تھی۔ ایک صاحبزادہ صاحب کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ وہ چھت پر پہونچ کر سامنے کی پتلی سی منڈیر پر تیز روی کی مشق کرنے لگے۔ یکایک سر نیچے ہو گیا اور پیر اوپر۔ اس جمناسٹک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دھماکا ہوا اور حضرت نیچے تشریف لے آئے۔ میں وہیں سے بیٹھا اس جمناسٹک کو دیکھ رہا تھا اور یہی پیشین گوئی بھی کر رہا تھا ——— مگر

میرے لئے کسی اضطراب کا موقع ہی نہ تھا کیونکہ باہر صحن میں کئی ایسی خواتین تھیں جو مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ اس لئے میں اپنی جگہ چپکا رہا۔

دوسرے میں نے دیکھ بھی لیا کہ بچہ عقلمند تھا۔ ایسی جگہ کو انتخاب کرکے گرا تھا جہاں ترکاریاں بونے کے لئے زمین کو اس قدر نرم کردیا گیا تھا کہ وہ گرتے ہی ٹانگوں کی طرف سے آدھا دھنس گیا۔

کمرے میں سب کے سب کھلبلا کر ہے ہے کرکے اُس کی طرف بھاگے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور پارسل جیب سے نکالا۔

"کچھ کھاؤ گی؟" میں نے جلدی سے پوچھا ۔۔۔ "بھوک ہے؟"

"ارے کوئی گر گیا ۔۔۔" انھوں نے کہا۔

میں نے کہا "بچ گیا ۔۔۔ بولو کھاؤ گی؟"

پوچھنے لگیں۔ "کیا ہے؟"

میں نے پراٹھے ان کو ایک نظر دکھائے جن کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بھوک کے آثار نمودار ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی خواہش کو چھپاتے ہوئے کہا کہ "ایسا نہ ہو کوئی آجائے۔"

میں نے کہا۔ "تو مت کھاؤ تم سے کہتا کون ہے؟" اور میں اس بنڈل کو محض ان کے ستانے کیلئے باندھ کر اپنی جیب میں رکھنے لگا۔

ہنسکر کہنے لگیں ۔۔۔ "شریر ۔۔۔ لا ادھر لا۔"

میں نے پراٹھے نکالے ۔ جلدی جلدی ان کے بڑے بڑے نوالے بنائے اور کچھ روکھے اور کچھ مچھلی کے ساتھ پے در پے ان کو دینا شروع کیے اب کیفیت یہ ہے کہ میں نوالے دیئے جاتا ہوں وہ چند کو مسلّم نگلنے کی کوشش کرتی ہیں اور چند کو ہاتھوں کی انگلیوں میں جمع کرتی جاتی ہیں ۔

بدقسمتی سے مچھلی میں کانٹے تھے جن کو اس رواروی میں نکالنے کا خیال بھی نہ رہا ۔ کئی کانٹے اُنھوں نے چبا ڈالے ۔ کئی نگل لیے مگر یکا یک ایک کانٹا جا کر حلق میں ایسا پھنسا کہ اس کے ساتھ نوالہ بھی معلق ہو کر رہ گیا اب نہ ادھر ہوتا ہے اور نہ اُدھر ۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پانی ڈھونڈتا ہوں تو ملتا نہیں ۔ باہر جانے کے لیے راستہ بھی مسدود تھا ۔ مقطع کا بند یہ ہے کہ ادھر ان کی آنکھوں سے آنسو نکلنا شروع ہوئے اور ادھر میرے ہاتھ پیر پھولنا شروع ہوئے ۔ کیا کروں اور کہاں جاؤں ؟ یہ سوالات تھے جو میں اپنے دل سے کر رہا تھا ۔

ہاتھ میں باقی ماندہ پراٹھے کے ٹکڑے لیے ہوئے میں کمرے کے بیچ میں کھڑا رہا ۔ مگر کچھ کر نہ سکتا تھا ــــــــــ اُدھر یہ بھی خوف تھا کہ اگر کوئی آ گیا اور پراٹھے کے نوالوں کو بستر پر پڑا ہوا اور کانٹے کو حلق میں اٹکا ہوا دیکھا تو کیا ہوگا ؟

طریقہ سے اس صورت میں جبکہ اس صورت میں کسی دوسری ذات کا ہاتھ ہو۔

"آخر کچھ کہو تو ہوا کیا"۔ میں نے دل سخت کرتے ہوئے تیز آواز میں پوچھا۔

"ہیں!" کہہ کر وہ میرے لہجہ کی کرختگی سے دفعتہً چونک پڑی اور مایوسی سے ایک زخمی ہرنی کی طرح میری طرف دیکھنے لگی۔

میرا دل نرم پڑ گیا اور میں بے اختیار ہو گیا مگر چونکہ اصول مملکت خویش کے خلاف تھا اس لئے مرحمت خسروانہ کے بجائے تنبیہانہ و تادیبانہ روش جاری رکھنے کا ارادہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مجھے کہنا ہی پڑا۔

"کسی نے آنکھ دکھائی ہو تو آنکھ نکال لوں؟"

خاموشی

"کسی نے انگلی دکھائی ہو تو انگلی قلم کر لوں؟"

"ایسے ہی میرے رفیق ہیں؟" اس نے جل کر کہا اور معاً منہ پھیر کر کمرے کے باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں ایک بیش قیمت بنارسی ساڑھی لئے ہوئے واپس آئی میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج خلاف معمول میری بیگم کا مورچہ میری کمزور ذات کی طرف کیوں ہے۔ شاید غصے اور رنج کے زور میں میری لائی ہوئی سوغات کو میرے ہی منہ پر پھینک دیا جائیگا۔ اور اس طرح شادی کے پانچ سال کے عرصہ میں محبت و الفت کا جس قدر رشتہ مضبوط ہوا ہے آج وہ بڑی بے دردی سے توڑ دیا جائیگا۔ مجھکو اس خیال سے واقعی طیش آیا اور چونکہ میں بالکل بے گناہ

تھا اس لئے میں نے بھی ارادہ کرلیا۔ کہ اگر اُس نے اس عزیز ترین سوغات کو واپس کردیا تو میں بھی اس کو کھڑے کھڑے آگ لگا دونگا۔

"بے وجہ روٹھنے۔ رونے اور چیزیں مُنہ پر مارنے کی وجہ"۔ میں نے غصہ میں ڈانٹ کر کہا۔ وہ اپنا رونا بند کر کے فرطِ تحیر سے میرا مُنہ دیکھنے لگی۔ اور اس کے بعد ساڑھی کے پرتوں کو کھول کر کہنے لگی۔ ــــــ "دیکھ لو"۔

اب میں آپ سے کس طرح بیان کروں کہ میں نے کیا دیکھا۔ بس اشارۃً اتنا ہی کافی ہے کہ سات سو پچاس روپے کی بنارسی ساڑھی کے سنہرے گل بوٹوں اور نقش و نگار پر اس صفائی سے پالش کی گئی تھی کہ زری کے تاروں پر کلابتوں کے تاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور یہ کارستانی کس کی تھی۔ آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ یہ نتیجہ تھا ایک مرغ اور مرغی کے جفاکش اور محنتی جوڑے کی کد و کاوش کا۔

بہرحال میں نے شروع میں کتنی غلط رائے قائم کی تھی۔ یہ معلوم کر کے مجھ کو بیحد ندامت ہوئی کہ بیگم کا غصہ مجھ پر نہیں تھا بلکہ میری بڑی بھابھی جان کے مرغی کے اس جوڑے پر تھا جو وہ چند روز قبل اپنے میکہ سے اپنی دادی اماں مرحومہ کی نشانی کے طور پر لائی تھیں اور جن کو وہ اتنا ہی عزیز رکھتی تھیں جتنا اپنے گود کے بچے محمود کو۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ محمود کی کلکاریوں سے ان کا دل جتنا باغ باغ ہوتا ہے اتنا ہی اس مرغے کی کڑک دار بانگ اور مرغی کی تیز کٹ کٹا اس سے بھی دل کو فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ اب ایسی حالت میں اگر اس قیمتی

ساڑھی کے برباد ہو جانے پر میں اپنے دلی غم واندوہ کو بیگم کے سامنے ظاہر کر دیتا
تو یقیناً دیورانی جیٹھانی میں ضرور دو دو چونچیں ہو جاتیں اور ان دونوں عورتوں
کی پھڑپھڑاہٹ میں ہم دونوں بھائیوں پر بھی چھینٹیں آتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا
کہ ایک گھر کے دو گھر بن جاتے ـــــ ان تمام وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے
میں نے اپنے سینہ پر صبر کا پتھر رکھا اور اس کو بھی تلقین صبر کی - میں نے وعدہ
کیا کہ آئندہ ماہ میں اس سے بہتر ساڑھی لا دونگا - تم اس کا کوئی سوگ نہ مناؤ
اور مصلحت وقت یہی ہے کہ اس حادثہ پر خاموش ہو جاؤ ـــــ میں نے اس کو
یہ بھی یقین دلایا کہ چند دن میں بھابھی جان کے شوق کی دھار رکے گی تو ان کا غم و ملال
کا تین پانچ ہو جائیگا - میری بیگم عقلمند معاملہ فہم اور صلح جو تھی اس لئے
بھابی جان سے ذکر تک نہیں کیا - اور اس طرح یہ معاملہ چند دن کیلئے دب گیا -

۳

ایک روز میں کالج سے بجا میں ہل ہلاتا ہوا آیا اور اپنے کمرے کی طرف چلا -
دروازے سب بند تھے کیونکہ میری خانم اس ساڑھی کے حادثہ سے سبق حاصل
کر چکی تھی - میں نے بیچ کے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا - کوٹ اتارا
کتابیں رکھیں - اپنے نواڑ کے ڈھیلے پلنگ پر بیٹھ کر جوتے کے فیتے کھولے اور اپنے
جلتے ہوئے جسم کو اس پلنگ پر پھینک کر پائنتی رکھے ہوئے لحاف کو اٹھا کر اوڑھ
لیا - تھوڑی دیر چت لیٹا رہا - اس کے بعد داہنی کروٹ لی - پھر بائیں کروٹ

لینے کے لئے پلٹا ـــــ ارے یہ کیا چیز میرے نیچے آگئی۔ گول گول سخت سخت ـــ اوہ۔ کمبخت ٹوٹ بھی گئی۔ ارے یہ قمیص گیلی کیوں ہو گئی ـــ لحاف ہٹا کر اٹھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک انڈا جرمر حالت میں پڑا ہوا نظر آیا۔ ندی سفیدی ایک ہو گئی تھی۔ چادر تر تھی اور قمیص لتھڑی ہوئی تھی۔ اب یہ معجزہ سمجھئے یا جادو خیال کیجئے کہ جس وقت میں پلنگ پر لیٹا ہوں تو انڈا اندازد تھا۔ آخر چند منٹ میں یہ عالم وجود میں کس طرح آیا؟

بخار سے رگیں تڑا رہی تھیں، چپ چپاہٹ سے تنفر پیدا ہو رہا تھا۔ اور اس پیچیدہ سوال سے الجھن۔ اسی جگہ بیٹھے ہوئے میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شیشے کی الماریوں کے آر پار دیکھا۔ نیچے دیکھ کر جائزہ لیا لیکن انڈے کے پہنچنے کا عقدہ نہ کھلا ـــــ یکایک میری نظر پلنگ کے سرہانے پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے تکئے سرہانے کی پٹی سے بہت زیادہ ہٹے ہوئے ہیں اور خلاف معمول اس کی سطح سے اونچے بھی ہیں ـــــ میں نے تکیوں کے پیچھے ہاتھ لیجا کر ٹٹولا تو "قیں" کی آواز آئی۔ اور کلمہ کی انگلی میں کسی کی سخت چونچ سے چٹکی کا اثر بھی محسوس ہوا۔ گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ تکیوں کے ہٹانے پر میں نے دیکھا کہ ہماری بھابی جان کی لاڈلی مرغی جان صاحبہ تکیوں کے پیچھے ہمارے پلنگ کی سفید چادر کے اوپر پر پھیلائے مجسم غیظ و غضب بنی ہوئی بیٹھی ہیں۔

"تسلیم بی صاحبہ! تسلیم، آپ کے انڈے کا شکریہ" ـــــ کٹ کٹ کٹاں،
کٹ کٹ کٹ کٹاں کے تیز سگنل ایک کہنہ مشق تار بابو کی طرح دینے لگی۔
"کیوں غصہ آگیا۔ میں نے انڈا توڑ دیا۔ اس لئے ـــــ ہاہ، مگر میں کیا
کروں، خود ہی لڑھک کر میرے نیچے آ رہا۔"
کٹ کٹ کٹ کٹاں، کٹ کٹ کٹ کٹاں، مجھ کو آیا غصہ۔ میں نے گردن
دبوچ کر اٹھا لیا اور ارادہ کیا کہ اس کو گھما کر اس طرح پٹخوں کہ کٹ کٹانا اور انڈے
دینا سب بھول جائے مگر معاً بھائی جان کا خیال آیا۔ اس لئے گھٹ کر رہ گیا ـــــ
اب سنئے مرغی کی پھڑپھڑاہٹ اور فریاد کی آواز برخوردار مرغ نے سنی۔ وہ بکارتا
ڈاڑھی ہلاتا، پروں کو پھٹ پھٹاتا آیا اور چاہتا تھا کہ اچک کر مجھ پر ایک کراری
ٹھونگ جمائے۔ مگر میں نے پیشقدمی کر کے ان کی تواضع لات سے کی اور مرغی
کو ایک ہلکی سی پٹخنی دیکر کمرے سے باہر کر دیا ـــــ جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ منہ
لٹکا کر کہنے لگی کہ "گھر بدلنا پڑ گیا ـــ اب ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

۳

تختوں کے چوکے پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چاندنی پر دسترخوان تھا۔ دسترخوان
پر کھانے کی قابیں، طشتریاں اور پیالے رکھے ہوئے تھے اور اس کے گرد حلقہ
باندھے ہوئے۔ ہم۔ بھابی جان، بھائیجان۔ خانم۔ محمود۔ جمیلہ اور ثریا بیٹھے
ہوئے تھے۔ اتفاق سے بھائی جان چوکی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور بھابی جان

ان کے مقابل بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک نوالہ خود کھاتی تھیں اور دوسرا نوالہ مرغی اور مرغ کے سامنے ڈالتی جاتی تھیں جو زمین پر گرتے گرتے غائب ہو جاتا تھا۔ اسی دوران میں محمود صاحب کی آنکھوں میں لگیں مرچیں۔ انھوں نے ہارمونیم بجانا شروع کیا اور بھائی جان اور بھابی جان نے کھانا چھوڑ کر اپنی توجہ کو ان کی طرف منعطف کر دیا۔ یہ موقع بہت غنیمت تھا۔ فوراً مرغی جان اچکیں اور بھائی جان کے سامنے کی روٹی پر چونچ سے حملہ کیا۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو دسترخوان سے ہٹا کر چمپت ہو گئیں۔ اب اس میں اس کا کیا قصور کہ بقیہ روٹیاں بھی اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے گر گئیں اور اسی چھپٹ میں شوربے کا پیالہ بھی سربسجود ہو کر اشک فشانی کرنے لگا۔ سارا دسترخوان تربتر ہو گیا اور لینا پکڑنا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

"آج ذبح کر ڈالوں گا کمبخت کو"——— بھائیجان نے جوش غضب میں للکار کر کہا۔ اور چشم زدن میں دسترخوان کے اوپر سے کیک کاٹنے کی چھری اٹھا کر لپک ہی تو پڑے۔ مرغی اور مرغ سے ریس کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ انھوں نے بھی ایسے ایسے کاوے دیئے۔ ایسی ایسی جھکائیاں بتائیں کہ بھائیجان کو دوڑتے دوڑتے پسینہ آ گیا۔ ہم سب بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ میں اور بیگم گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح ان پر شرط لگانے لگے۔ وہ کہتی تھی کہ مرغی اوّل رہیگی اور میں کہتا تھا کہ بھائیجان بازی جیتینگے۔ آخر مرغی نے گھبرا کر روٹی چھوڑ دی اور زمین پر دوڑنے کے بجائے ہوا میں فراٹے بھرنے لگی۔ اور مرغ نے اس

کی قدموں اور پروں کے ساتھ تقلید کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ بدحواسی میں ان دونوں نے ہماری ہی طرف رخ کیا اور دسترخوان کو پھلانگتے ہوئے۔ روٹیوں پر کیچڑ بھرے پنجوں سے چھاپہ مارتے ہوئے۔ پلیٹوں اور رکابیوں میں کوڑے کی مٹی کو جھٹکتے ہوئے اور بقیہ شوربے کے پیالوں کو دھکے دیتے ہوئے یہ جا وہ جا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ بھابی جان جو کھانے کی بربادی کے مقابلے میں اپنی مرغی اور مرغ کی بدحواسی اور پریشانی پر بیٹھی ہوئی پیچ و تاب کھا رہی تھیں بول اٹھیں ۔۔۔۔۔۔ "کہیں پکڑ ہی نہ لیا ہو۔"

بھائی جان جو اس دوڑ میں کچھ سست ہو چکے تھے پھر تیز ہو گئے اور انہوں نے زیادہ مستعدی سے تعاقب کرنا شروع کیا۔ مگر مرغیوں کا جوڑا جو اس بھاگ دوڑ میں ہارنے کے قریب تھا۔ سامنے کے دروازے میں سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بھائیجان بھی اسی طرف چلے۔ وہاں جاکر مرغی تو تخت کے نیچے چھپ کر غائب ہو گئی اور مرغ نے پروں کو پھٹ پھٹا پھٹ پھٹا کر اچھل کود کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ بھائی جان قریب تھا کہ اس کو پکڑ لیتے مگر اتفاق سے مرغ نے ایسی چھلانگ لگائی کہ کارنس پر رکھے ہوئے تمام چینی کے برتنوں میں تلاطم پیدا ہو گیا اور ان میں سے بہت سے جھن جھناتے ہوئے نیچے آکر شہید ہو گئے اب موقع تھا بھائی جان کا ۔۔۔۔۔۔ برتنوں کے اور وہ بھی جہیز کے برتنوں کی جھنکار نے ان کو لرزہ براندام کر دیا اور وہ گرجتی ہوئی بھائی جان کے قریب

پہونچ گئیں۔ دو چار جھپکیوں ہی میں بھائی جان کمزور پڑ گئے اور یہ ڈراما اس طرح ختم ہوا کہ برتن ٹوٹے الگ۔ فاقہ ہوا الگ۔ لڑائی ہوئی الگ۔ مگر فساد کی جڑ مرغیاں اسی طرح صحیح وسلامت رہیں۔ بیگم کو اس کا بے انتہا افسوس ہوا کہ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا ـــــ اس کو آج یقین ہو گیا تھا کہ یہ گھر اس اگھوری مخلوق کے وجود سے بالکل پاک ہو جائیگا۔

۴

آج ہماری پرانی ماما چمن کو بھائی جان نے نوکری سے برطرف کر دیا کیونکہ وہ جانوروں پر ظلم کرتی تھی۔ انھوں نے احسان کیا کہ مقدمہ نہیں چلایا ورنہ اُس کو سزا ہوتی۔ اول تو یہ کہ وہ مرغیوں کو حتی الامکان ٹاپے میں بند رکھتی تھی اور اس طرح ان کو تازہ ہوا سے محروم رکھتی تھی۔ جب بھائی جان نے ان جانداروں پر رحم کھا کر ان کو تھوڑی دیر کے لئے آزادی دے دی تو اتفاق سے وہ باورچیخانے میں پہونچ گئے۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی روٹی پکا رہی تھی ـــــ مرغی نے محض مذاق سے سینی میں سے اگر ایک پیڑا اٹھا لیا تو اس کو کون چھپن کروڑ کی چوتھائی کا نقصان ہو گیا۔ مگر گلچمن نے اس بیزبان پر اتنی زیادتی کی کہ معًا ان پر پھکنی چارج بول دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچاری لنگڑی ہو گئی۔ جی ہاں اگر مر جاتی تو یہ خون کس کی گردن پر ہوتا۔ آج کو اس نے مرغی پر ہاتھ اٹھایا۔ کل کو وہ اتنی جرات کریگی کہ خود میاں جب کوئی شرارت کرینگے تو ان کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی سلوک

کریگی - واہ جاندار سب برابر ہیں - یہ تو مرغی ہے - ہندوستان میں تو ایک گائے کی دُم کے ٹوٹ جانے پر ہزاروں انسانوں کے خون بہہ جاتے ہیں -

۵

بیگم اسکول کی پڑھی ہوئی خاتون ہے - وہ انگریزی فیشن کی بڑی دلدادہ ہے کیونکہ وہ ہر وقت گھر کی صفائی میں لگی رہتی ہے - ابوالحسن تاناشاہ کی روح نے عورت کا جنم لیا ہے - کفر کے کلمے تو دیکھئے کہتی ہے کہ صفائی خدا تک پہونچا دیتی ہے گویا مذہب کوئی چیز ہی نہ ہوا - یہ تعلیم دلانے کا پھل ہے اور کیا کہا جائے -

مرغیاں کوڑا بکھیرتی ہیں اور صحن میں گڑھے کرکے ان کی خاک میں لوٹتی ہیں یہ الزام ہے جناب ------ مگر اتنا خیال نہیں کہ یہ رزق کے دانے جو بھولے چوکے زمین پر گر جاتے ہیں اور چلنے والوں کے پیروں کے نیچے آتے ہیں ان کا عذاب کون بھگتیگا؟ بیچاری مُرغیاں ان کا کھوج لگا لگا کر چن لیتی ہیں -- تو یہ بُرائی ہوگئی - ہاں یہ مانتی ہوں کہ کبھی کبھی غلیظ کھا جاتی ہیں - مگر اس سے کیا قباحت ہوگئی - پیٹ میں کس کے پاکیزگی ہے؟ اس پر طعن یہ مارتی ہیں کہ جب یہ مرغیاں گھر میں موجود ہیں تو مہتر کی کیا ضرورت ہے؟

کل بیٹھے بیٹھے تنک مزاجی سوار ہوئی تو پانی پینے کے گھڑوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا - جب پوچھا تو جواب ملا کہ ------ "مُرغیوں نے چونچیں ڈالی تھیں" -

ارے صاحب! مُرغیاں اپنی چونچ اس طرح رگڑ رگڑ کر صاف کرتی ہیں کہ ہم اپنا مُنہ بھی صاف نہیں کرسکتے۔ مذہب سے ثابت ہے کہ حلال جانوروں کے مُنہ اور چونچیں پاک ہوتی ہیں۔ خیر اگر ناپاک ہی سہی تو اتنا نہیں دیکھ سکتے کہ گھڑے ڈھکے رہیں مگر اتنی محنت کس سے ہو؟

روز روز کا پیٹنا ہے کہ ساڑھی خراب کردی۔ بستر کی چادر خراب ہوگئی۔ مگر یہ بھی تو کہئے کہ وہ تو جانور ہیں۔ ان کو عقل و تمیز کہاں کہ یہ بستر ہے اور یہ زمین۔ آخر کمرے کا دروازہ بند کیوں نہیں رکھا جاتا۔ چیزیں کھُلی کیوں رکھی رہتی ہیں۔ اچھا یہ بھی سہی۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ میرا محمود ہی کبھی کبھی بستر اور توشک خراب کردیا کرتا ہے تو کیا میں اس کو گھر سے نکال دونگی؟ اچھی کہی۔

ایک الزام ہو تو کہوں۔ کہتی ہیں کہ چائے میں مرغی کے پر نکلے۔ اچھا نکلے۔ مگر میں اس بات کا ثبوت دیسکتی ہوں کہ چائے تو چائے کھانے اور سالن میں سر کے بال نکلا کرتے ہیں ـــــــ اس کے یہ معنی ہوئے کہ سر کی چوٹی کاٹ ڈالی جائے واہ اچھی منطق ہے۔

اور سنئے مُرغا رات کو بھی سونے نہیں دیتا۔ اللہ ری نزاکت، یہ سڑک پر سپاہی بولتے ہیں جاگتے رہو! ـــــــ ذرا ان سے کہدینا کہ بھئی ہائیں شور کیوں مچاتے ہو۔ ارے خاموش رہو۔ ہماری نازک دماغ بیگم صاحبہ آرام فرما رہی ہیں اگر ایسا ہی ہے تو وہ میرے محمود کا رات کا رونا بند کرائینگی ـــــــ برخلاف

اس کے ان کو مرغ کا شکر گذار رہنا چاہئے کہ سویرے سویرے موذن کی اذان سے پہلے اذان دیتا ہے اور خداوند کریم کی حمد و ثنا کرکے گھر میں برکت لاتا ہے۔ خدا توفیق دے تو اس جانور سے سبق لیکر اذان و نماز، تسبیح و درود سیکھیں مگر اتنا ہوش کسے؟

میم بنی ہیں بیچاری، مگر اتنا نہیں معلوم کہ میں ہی مرغیوں کو پالتی ہوں اور کتوں کو پیار کرتی ہیں —— غرضکہ ان کو ضد ہے مجھ سے! اور میرے میکہ کی سوغات سے۔ بھلا دادی اماں کی نشانی میرے پاس کیسے رہے۔ مگر منہ دھو رکھیں ان کی مجال تو ہے نہیں کہ میری مرغیوں کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھیں۔ اس روز چھری اٹھائی تھی تو میں نے حشر برپا کر دیا تھا۔ کس میں ہمت ہے۔ اس کو دیکھوں کون ہے ذبح کرنے والا؟ دھمکی دیتی ہیں گھر چھوڑنے کی۔ چھوڑ دیں مجھ پر احسان کیا؟ یہ بھی بہانہ ہے۔ دل تو خود الگ رہنے کو چاہتا ہے —— ابھی پارسال کی بات ہے کہ بی صاحب نے طوطا پالا تھا —— تو کیا میں نے بھی گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی۔

حد کر دی ہے۔ کہتی ہیں کہ مرغیوں نے میرے پیڑوں کے پتے کھا کھا کے ان کا ستیاناس کر دیا۔ میں کہتی ہوں کہ اول تو پیڑوں سے مچھر پیدا ہوتے ہیں جن سے ملیریا ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اس کا خیال نہ بھی کیا جائے تو ان کے گملوں کو کسی اونچی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے یا جالی لگائی جا سکتی ہے۔ تیسرے

مُرغیاں نیچے کے پتے ٹھنگتی ہیں۔ اس عمل سے تو پیڑ پھل پھلا کر بڑھتے ہیں۔ آخر مالی بھی تو نیچے ہی کے پتے کاٹ کر پھینکتے ہیں ـــــ اتنا علم نہیں تو اسکول کی پڑھائی کس کام کی ؟

الزام گنا دیئے۔ یہ نہیں جانتیں کہ جب سے گھر میں مرغیاں آئی ہیں رونق ہوگئی ہے۔ چوہیوں سے بھی پیچھا چھوٹا ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر ڈالتی ہیں پتنگوں اور ٹڈوں کو بھی کھا جاتی ہیں، انڈے دیتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرا محمود ان کو دیکھکر خوش ہوتا ہے۔

یہ لُبِّ لباب ہے، ہماری بھابی جان کی جوابی تقریر کا جو انھوں نے خانم کی تحریک کہ "مرغیوں کا وجود صفائی پسند انسانوں کے لئے عذاب ہے" اس کی مخالفت میں وقت کے وقت سُنائی تھی۔ اور اس کی تجویز کے چیتھڑے بکھیر کر رکھدیئے تھے ـــــ اگر ہوتی یہ تقریر پارلیمنٹ میں تو آج لیڈر۔ پائنیر اور ٹائمس کے صفحات بھرے ہوئے ہوتے ـــــ بھابی جان زندہ باد!

۶

بیگم دُبلی اور کمزور ہو رہی ہے۔ مُرغیاں موٹی اور فربہ ہو رہی ہیں۔ اور لیجئے۔ وہ آئندہ کے خطرے سے کانپی جا رہی ہے۔ بھابی جان نے ایک الٹی میٹم اور دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ مرغی لگاتار انڈے دیتی ہے۔ کڑک ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کے انڈے بٹھائے جائینگے۔ اللہ بچائے۔ اب تو اس گھر

کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایک ہی جوڑے نے میری بیگم کو دُبلا اور کمزور کر دیا ہے اب یہ مُرغیوں کی فوج ضرور اس کو مرض دق میں مبتلا کر دیگی۔ وہ یوں بھی ڈرتی ہے کہ مرغی کے بچوں میں رُجیں ہوتی ہیں جو سارے بدن کو نوچ ڈالتی ہیں۔ میری جان سخت مشکل میں ہے۔ یہ گھر ایسا ہے کہ یہاں کوئی بلّی بھی نہیں آتی، ورنہ ایک ہی رات میں مشکل آسان ہو جاتی ـــــ سحر و شام التجا ہے کہ بلیوں کی نسل میں افزائش ہو۔

۷

گھر میں کچھ نئی عورتیں آیا کرتی ہیں۔ خوانچے والیاں اور پان تمبا کو کھانے والیاں۔ اول الذکر بھابی جان کو بہت سستا سودا دیتی ہیں اور آخر الذکر شہر کے اخبارات کا اقتباس سناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان پر بہت جلد اپنا سکّہ جما لیا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کی اسکیم ہے جس کو بار آور کرنے کیلئے مجھ کو اپنی جیب پر بار ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں میری بیگم کی سخت مزاجی کی شکایتیں بھی کرتی رہتی ہیں اس لئے بھابی جان ان کو اور بھی عزیز رکھتی ہیں۔

آج ننّو کی امّاں، دھنو مہری، اور خیراتی کی بہو نے یکزبان ہو کر مرغی اور مُرغ کی تعریف میں قصیدے پڑھے اور بھابی جان کو یہ یقین دلانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ ان جانوروں کے جوڑ کا دوسرا جوڑ کسی والی ملک کے یہاں ہو تو ہو ورنہ کہیں اور نہ ہوگا،

ایک نے کہا ــــــ "دیکھنا کیسا بانکا مُرغ ہے۔ سچ کوئی فوج کا کرنیل معلوم ہوتا ہے۔"

دوسری نے کہا ــــ "اس کلغی اور تاج سے شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔"

تیسری نے کہا ــــ "مرغی کیا ہے، بس چوتھی کی دُلھن ہے۔"

بھائی جان نے کہا ــــــ "قدرت کی کاریگری ہے کہ ان سُنہری روپہلی پروں کے سامنے زیور بھی ہیچ ہیں۔"

جواب ملا کہ ــــ "مرغی کو دیکھ کر مجھے اپنی صورت سے شرم آرہی ہے۔"

تائید ہوئی کہ ــــ "کاش اللہ میاں ہمیں مرغی ہی بناتے۔"

اضافہ ہوا کہ ــــ "ایسے کہاں نصیب!"

سب نے قہقہہ لگایا۔

بھائی جان نے فخریہ کہا کہ "یہ میری دادی اماں کی شوق کی چیزیں تھیں۔ اور ان کا شوق ایسا ہی ہوتا تھا کہ دور دور اس کا شہرہ ہو جاتا تھا۔ بدقسمتی تو یہی ہے (آہ بھر کر) کہ ان کو ان مرغیوں کی بہار دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔"

یکزبان ہو کر دُعا دی گئی کہ "خیر اللہ آپ کو سلامت رکھے اور ان کی بہار دیکھنا نصیب کرے۔"

اسی اثناء میں مرُغ نے مُنہ کھول کر اذان دی۔ جس کو سنتے ہی ننّو کی اماں نے کان کھڑے کیئے۔ دھنو مہری نے بھنویں چڑھائیں اور حیرانی کی بو نے چہرے

پر خوف کے آثار لاکر کپکپی لی اور یحیا رگی کانوں میں انگلیاں دیکر اٹھنے کا ارادہ کیا جس پر فتو کی اماں نے چٹکی لے کر بٹھا لیا۔ اس گونگے تماشے کا مطلب بھابی جان کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ انھوں نے متحیر ہو کر وجہ پوچھی تو ان عورتوں نے ٹالنا چاہا مگر اتفاق ایسا کہ مرغ نے پھر اذان دی جس کو سنتے ہی وہ دونوں عورتیں بھی اسی ایکٹ کو دہرانے لگیں جو خیراتی کی بہو نے اول بار کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھابی جان اس کی علت غائی کے معلوم کرنے پر بضد ہوئیں۔ اور وہ عورتیں اس کو پوشیدہ رکھنے پر مصر ہوئیں۔

"کچھ بھی نہیں!"

"مذاق تھا۔"

"نہیں مذاق نہیں تھا —— تمھیں بتانا پڑیگا۔"

"آپ سے ڈر لگتا ہے۔ ہماری اوقات ہی کیا کہ آپ کے سامنے منہ کھولیں۔"

"میں اجازت دیتی ہوں —— کہو۔"

"نہیں بیگم، نہ کہیں گے۔"

"تمھیں ہمارے سر کی قسم۔"

آخر ش خیراتی کی بہو نے ڈرتے ڈرتے منہ کھولا ہی تھا کہ فتو کی اماں نے جھڑک کر روک دیا۔ مگر دھنو مہری نے اجازت دیدی۔

کہنے لگی کہ —— "آپ کے مرغے کی بانگ بہت منحوس ہے۔"

بھابی جان نے تیوریوں پر بل لاکر پوچھا ــــ "کیسے؟"

"چوپٹ گاؤں بولتا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"بات یوں ہے کہ مرغ تین طرح کی آواز نکالتے ہیں۔

دا تا گاؤں

ستره گاؤں

چوپٹ گاؤں

آپ کا مرغ چوپٹ گاؤں بولتا ہے اور کبھی کبھی "تجھکو کھاؤں" بھی کہتا ہے۔ ایسے کو تو حلال کر کے اس کی بوٹیاں اپنے اوپر سے صدقے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دینا چاہیئے"

بھابی جان نے غصّہ میں کہا۔ "ہٹ جھوٹی۔"

سب نے بیک آواز کہا کہ ــــ "خدا غارت کرے جھوٹ بولنے والیوں کو۔"

ایک نے کہا ــــ "کوئی فائدہ ہے ہمارا؟"

دوسری نے کہا ــــ "کوئی دشمنی ہے آپ سے۔"

تیسری نے کہا ــــ "ہم تو ابھی اس کی تعریف ہی کر رہے تھے۔"

اس اثناء میں مرغ نے پھر اذان دی۔ جس پر بہنوں نے کانپتے ہوئے کہا کہ دیکھیئے "تجھکو کھاؤں" صاف بول رہا ہے۔"

بھابی جان نے کان لگا کر سنا تو کہنے لگیں کہ "ہاں کچھ شک تو مجھے بھی آتا ہے۔"

جواب ملا کہ ــــ "شک کیسا وہ تو بہرا بھی سُن لیگا۔"

دھنّو جہری نے کہا ــــ "جان ہے تو جہان ہے، اس کو ابھی حلال کیجیئے۔"

اصرار ہوا کہ ــــ "دیر نہ کیجیئے۔"

تجویز ہوئی کہ ــــ "مرغی بھی اسی نسل کی ہے اس کو بھی لیجیئے۔"

شہادت میں قصہ بیان ہوا کہ ایک ایسا ہی مُرغا تھا ہمارے محلہ میں ــــ اُس کے آنے کے چھ مہینہ بعد سارا گھر صاف ہو گیا ــــ پہلے میاں مرے پھر بیوی کی جان گئی۔"

بھابی جان کانپنے لگیں ــــ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت میں مکان سے نکلا ہوں تو خیراتی کی بہو کیک کاٹنے کی چھُری پتھر پر تیز کر رہی تھی۔ اور دھنّو جہری اُن دونوں کو گھیر کر ٹاپے میں بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیگم کے متعلق اگر آپ استفسار کریں تو میں یہ بتانے کے لئے تیار ہوں کہ وہ کمرے میں کھڑی ہوئی اپنے مُنہ میں رومال ٹھونس رہی تھی۔ تاکہ ہنسی کی آواز نہ نکلے۔

(سالنامہ نیرنگ خیال)

نانا جان

ہمارے نانا ابا خدا بخشے بڑے اللہ والے آدمی تھے۔ ان کی عمر پچھلی برسات میں چھیاسٹھ برس کی پوری ہوگئی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جن کو وہ انڈے کا تیل لگا کر خوب موڑ موڑ کر تاؤ دیا کرتے تھے۔ ڈاڑھی گھنی تھی اور بیچ میں سے دونوں کلّوں کے اوپر چڑھا لی تھی۔ قد لمبا اور ہاتھ پیر خوب مضبوط تھے۔ جس وقت وہ روئی کا لمبا دگلا پہن کر اپنی داڑھی کو کس کر سر پر پگڑی باندھ لیتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چھتری چلا آرہا ہے۔

ہم لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ ہم کو جب وہ شرارت کرتے دیکھ لیتے تھے تو غصے سے ان کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی تھیں اور دُور سے ایک لمبی ڈانٹ بتاتے تھے اور ہماری طرف اپنا بھاری ڈنڈا لیکر دوڑتے تھے تو ہم سوائے اس کے کہ اپنے پاجامے کو تر کردیں اور کچھ بن ہی نہ پڑتا تھا۔

وہ بڑے بہادر تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے بنوٹ کے بل پر سو دو سو آدمیوں سے اکیلے مقابلہ کیا ہے۔ میری لکڑی بالکل اس طرح گھومتی تھی جس طرح انڈین ڈگلس اپنی تلوار کو تنکے کی طرح چلاتا ہے۔ میری لکڑی سے لوگ پروانوں کی طرح پٹ پٹ

گرتے تھے۔ انڈین ڈگلس کی طرح نہیں کہ مارتا سب کو ہے لیکن زخمی کسی کو بھی نہیں کرتا۔ حقّہ بہت پیتے تھے۔ کش کھینچتے جاتے تھے اور اماّں جان کو اپنی بہادری کی داستان سناتے جاتے تھے۔ ہم لوگ بھی چپکے بیٹھے سنا کرتے تھے۔ رات کا وقت ہوتا تھا۔ اتفاقاً اگر ہم کو نیند آ گئی تو فوراً ہمارے کان کی لوک کو گھما کر خوب ہی چھالی بھر دیتے تھے اس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ ہم چھوٹے انجن کی طرح اپنی سیٹی کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے اور ہماری یہ آواز اس وقت تک کم نہ ہوتی تھی جب تک کہ ہمارے کان کی لوک ختم نہ ہو لیتی تھی۔

"بدنصیب کمبخت!" ہم رو رہے ہیں اور وہ لکچر پلا رہے تھے۔" ارے میں تو تیری ہی لئے یہ قصّے کہتا ہوں کہ تو بہادری پکڑ۔ تو جو اتنا بزدلا ہے کہ تجھے اپنا نواسہ کہتے مجھے شرم سی لگتی ہے۔" اماّں جان ہمیں اٹھا کر گلے سے لگا لیتی تھیں اور پیار سے ہمارے سر کو تھپ تھپانے لگتی تھیں تو ان سے کہتے تھے کہ" بڑی مامتا ہے جاؤ اسے میرے سامنے سے لیجاؤ۔ کان پھٹے جاتے ہیں۔ بھئی اب میں سوؤں گا" دوسرے روز پھر جب حقہ پینے بیٹھتے تھے تو تاکیداً اماّں جان کو بلا کر بٹھاتے تھے اور ہم لوگوں کو اپنے کارنامے سناتے تھے۔ اسی دوران میں اگر ہمارے باوا جان آ گئے بس وہ فوراً داستان بند کر کے حقہ پھونکنے لگتے تھے اور ہم سے کہتے تھے کہ جاؤ سوؤ، زیادہ رات تک مت جاگا کرو۔

ہماری چھوٹی باجی منیرہ ان سے بہت گستاخ تھیں وہ اسی وقت ضد کر کے

کہنے لگتی تھیں کہ "اللہ! یہ تو بتا دیجیے کہ آپ نے اس اژدہے کا منہ کس طرح چیرا"۔ تو فوراً رخ بدل کے گلچمن کو آواز دیتے تھے۔ حقے سلگو کو گالیاں دیتے تھے اور آگ کو کوسنے لگتے تھے کہ کمبخت چلم کو سلگنے ہی نہیں دیتی — بھائی ابا سمجھ جاتے تھے اور مسکراتے ہوئے وہاں سے پلٹ آتے تھے۔

ایک روز ہم سے پانی کا لوٹا منگایا۔ ہم سات برس کے تو تھے۔ ان کا جنگی لوٹا جو لوٹوں کا قبلہ گاہ تھا کس طرح اٹھا کر لاتے۔ ہم نے اٹھا تو لیا لیکن فوراً ہاتھ سے چھوڑ بھی دیا۔ پانی ادھر گرا۔ غصہ ادھر انھیں آیا اور کانپے ہم۔

"جمیلہ!" ہماری ماں کی طرف مڑ کر بولے۔ "ارے یہ کیسا لڑکا ہے؟ اس کا علاج کراؤ۔ جب یہ لوٹا تک نہیں اٹھا سکتا تو اپنا گھر بار کس طرح اٹھائیگا؟" —

"ارے دیکھ!" ہماری طرف مڑ کر اپنی آستین کہنیوں تک چڑھا کر گرجتے تھے "خبردار جو تو نے مجھے نانا ابا کہہ کر پکارا۔ میں نہ تمہاری ماں کا باپ اور نہ تمھارا نانا۔ نام بدنام کریگا۔ ارے وہی احمد علی (خود کا نام) جن کا نام بہادری میں دنیا جانتی ہے۔ ان کا نواسہ اتنا کمزور۔ ہائے افسوس! جب میں اتنا بڑا تھا۔ تو ریذیڈنسی کی توپ کا گولہ تنکے کی طرح اٹھا لیا کرتا تھا۔ جوانی میں تو میں نے اناج سے بھری ہوئی گاڑی کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر کیچڑ سے باہر نکال کر سڑک پر کر دیا تھا"۔

۲

ماموں جان کی نئی شادی ہوئی تھی۔ دُلھن ممانی گھونگھٹ کاڑھے سر جھکائے صحن میں چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی چھوٹی اور منجھلی باجی۔ نیم والی بجیا۔ ننھی صاحبزادی۔ بیگم آپا اور بہو ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں جان چوکے پر تھیں۔ بڑی آپا وظیفہ پڑھ رہی تھیں اور نانا جان کچھ فاصلے سے مسہری پر بیٹھے۔ پیر نیچے لٹکائے حقہ پی رہے تھے۔ مردوں میں اور کوئی نہ تھا سب باہر مکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

گلچمن پانی بھرنے صحن کے نل کے پاس آئی اور یکایک گھڑا اچھینک کر لگی چلانے ——— "ہے ہے سرکار سانپ!" اس الارم کی گھنٹی کی آواز نانا جان کے کان میں جو گئی تو بس اچھل پڑے۔ گھبراہٹ میں حقہ اوندھ گیا۔ چلم ٹوٹ گئی حواس جاتے رہے۔

"ارے کہاں ہے؟" انھوں نے ایسی آواز نکال کر کہا جیسے خواب میں ڈر گئے ہوں۔

"وہ آپ کے سرہانے مسہری کے پائے کے پاس۔" اس نے اشارہ کر کے کہا۔

اتنا سننا تھا کہ نانا جان ہی ای ای کر کے جوتہ پہنے ہوئے مسہری پر چڑھ گئے۔ حالانکہ تلوؤں کی کیچڑ سے سفید چادر لت پت ہو گئی اور لگے اچکنے۔ لطف تو یہ تھا کہ تمام عورتیں، لڑکیاں اور بچے پلنگوں اور تختوں پر کھڑے "ہے ہے

سانپ، ہے ہے سانپ" کا ماتم کر رہے ہیں اور نانا جان بھی اسی میں اپنا سُر لاکر "ہے ہے سانپ، ہے ہے سانپ" الاپ رہے ہیں ــــــ آخر ہماری بڑی آپا (نانی اماں) کو ہوش آیا اور حواس ٹھکانے ہوئے تو انھوں نے چلاکر کہا۔ "ارے مردوں کو بلاؤ سانپ ہے۔" جس پر ہمارے نانا جان نے بھی اسی طرح ہاں میں ہاں ملائی ــ "ارے مردوں کو بلاؤ ــــــ" گویا وہ خود مرد نہ تھے۔ ان کے اس طرز عمل پر اب نانی اماں کو غصہ آیا اور وہ ان کی طرف آنکھیں نکال کر بولیں۔ "ارے آخر ــــــ"

وہ یہیں تک کہنے پائی تھیں کہ باہر سے مرد آگئے اور اپنی اپنی لکڑیاں لے کر بڑھے ہی تھے کہ نانا جان نے گھبرا کر کہا۔ کہ "دیکھو! مجھے میرے کمرے میں پہونچا دو میں جا کر اپنی لکڑی لیتا آؤں۔ اتنی دیر سے لکڑی مانگ رہا تھا کسی نے دی ہی نہیں ورنہ اب تک مار کر ٹکڑے اُڑا دیئے ہوتے ــــ"

کسی نے ان کی طرف خیال نہ کیا۔ خالو آبا نے لکڑی اٹھا کر سانپ پر ماری ہی تھی کہ ماموں جان نے لپک کر ہاتھ میں اٹھا لیا اور گھما کر عورتوں کی طرف پھینک ہی تو دیا ــــــ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیخیں مار مار کر ایک پر ایک گرتا پڑتا بدحواس ہو کر بھاگا۔

اسی اثنا میں میری نظر پڑ گئی۔ میں نے بیدھڑک جا کر ہاتھ سے اُٹھا لیا کیونکہ وہ سانپ نہیں تھا بلکہ چمڑے کا ایک گاؤ دم فیتہ تھا جو میں کھیلتے کھیلتے

نانا جان کے سرہانے بھول کر چلا آیا تھا۔

(سہیلی)

کنوارے کا مکان

میرے مکان میں اندر باہر کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کیونکہ جب میں مکان کے باہر ہوتا ہوں تو اس کا دروازہ بند رہتا ہے اور جب اندر ہوتا ہوں تو کھلا رہتا ہے اس کے داخلہ پر "بغیر اجازت اندر آنے کی اجازت نہیں" کی تختی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ریل کے ڈبوں میں "حکومت" کی تختی کی طرح بالکل ہی بیکار ثابت ہوتی ہیں ملاقات کے اوقات بھی مقرر نہیں کر سکتا کیونکہ میرے دوست ریل گاڑیاں نہیں ہیں کہ انھیں تصادم کا اندیشہ ہو۔ وہ تو اتنا جانتے ہیں کہ دنیا میں میرے لئے دو ہی چیزیں تخلیق کی گئی ہیں ایک دفتر اور دوسرے وہ خود اس لئے اس اصول پر کہ قدرت میں خلا محال ہے وہ مجھ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ بعض اوقات میں اس قدر پریشان ہو جاتا ہوں کہ حضرت آدم کے ——— ان لمحوں پر رشک کرنے لگتا ہوں جبکہ وہ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اکیلے بیٹھے ہوئے حوا کے فراق میں آنسو بہا رہے تھے چنانچہ اگر دنیا دوبارہ بسائی جائے اور مجھ کو بابا آدم کا روپ دیا جائے تو میں ایسی تنہائی پسند کرونگا کہ جس میں حوا کا فراق بھی مخل نہ ہو۔

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کے عنوان سے سجاد حیدر یلدرم نے دوستوں کی صرف اتنی شکایت کی ہے کہ وہ انھیں مضمون نہیں لکھنے دیتے لیکن مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دینگے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کا تعلق کسی دہشت پرست جماعت سے ہے۔ بلکہ دنیا کے تمام دوستوں کی طرح وہ بھی نیک نیت واقع ہوئے ہیں اور دراصل میں ان کی نیکی ہی کا شاکی ہوں۔

کبھی کبھی میں ہنس کر اُن سے شکایت کرتا ہوں تو وہ مقابلتہً زوردار قہقہہ لگا کر میری بات کو اڑا دیتے ہیں اور آخر میں وعدہ کرتے ہیں کہ جب میری شادی ہو جائیگی تو وہ مجھکو تکلیف نہیں دینگے۔ لیکن یہ تو الٹی منطق ہے۔ وہی تو زمانہ ہے جبکہ دوستوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور جوں جوں انسان معمر ہوتا جاتا ہے یہ ضرورت بڑھتی ہی جاتی ہے کیونکہ اس وقت بیوی کی زیادتیوں سے دوست محفوظ رکھتے ہیں اور دوستوں کی زیادتیوں سے بیوی۔ دراصل انسانی مسرت کا راز اسی اصول میں مضمر ہے کہ انسان خود کو کسی کے ہاتھ بالکل ہی فروخت نہ کر دے بلکہ بیعانہ اور بیعنامہ کے بین بین رہے۔ کیا یہ سب کا تجربہ نہیں ہے کہ کرسی کی پشت پر بھی زیادہ تکیہ کرنے سے سر نیچے ہو جاتا ہے اور ٹانگیں اوپر۔

میرا مکان بیک وقت۔ کتب خانہ۔ چوپال۔ مسافر خانہ اور ہسپتال ہے۔

چند دوست جو کتابوں اور رسالوں کے بہت شوقین ہیں میرے یہاں صرف مُطالعہ

کی غرض سے آتے ہیں اور جب تک ان کا جی چاہتا ہے اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے اسکندریہ کے عجائب خانے میں مرمریں مجسمے۔ ان سے مجھے شکایت تو نہ ہونی چاہئے لیکن ان کے چلے جانے کا بعد جب میں اپنی الماریوں کی منتشر کتابوں کو دیکھتا ہوں تو مرہٹوں کی ہزیمت خوردہ فوجی صفوں کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تعداد میں بھی کمی واقع ہورہی ہے۔ دوستوں کی نہیں بلکہ کتابوں کی، کیونکہ ان کو شروع میرے یہاں کیا جاتا ہے اور ختم اپنے یہاں۔ حالانکہ وہ انتہائی راستبازی سے نیت کرتے ہیں کہ ان کو ضرور واپس کردینگے۔

میرے دوستوں کے مہمان واقعی اس الزام سے بری نہیں کئے جاسکتے کہ وہ ہمیشہ اچانک حملہ آور ہوتے ہیں چنانچہ ایسی مجبوری کی حالت میں جبکہ ان کے ٹھہرانے کا کوئی فوری بندوبست نہیں کیا جاسکتا وہ میرے مکان میں قیام کرلیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیئے اور اگر اتفاقیہ طور سے ان میں سے کوئی صاحب بہ سبب خرابی آب وہوا بیمار ہوجائیں تو غسل صحت سے قبل کس طرح اس قابل ہوسکتے ہیں کہ سفر کی صعوبتوں کو برداشت کریں اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مسافر اور مریض ہر انسان کی بہترین ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ سب پر کبھی نہ کبھی یہ وقت پڑا ہی کرتا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ میں آدم بیزار بھی نہیں ہوں — میں تو

بھاری سے بھاری ہمان اور وبائی سے وبائی بیماری سے بھی پریشان نہیں ہوتا لیکن نہیں برداشت کرسکتا تو ان لوگوں کو جو رات میں سوتے وقت کھانستے ہیں اور خراٹے لیتے ہیں بالخصوص ایسی کھانسی جسے ہم "حقہ کھانسی" کہہ سکتے ہیں اور ایسے خراٹے جو بکرے کی گردن پر چھری رکھنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میری برگشتہ قسمتی میرے دوستوں کی شکل میں چوبیس گھنٹہ میرے ساتھ رہتی ہے جس کے لئے مکان اور زمان کی قید نہیں۔ اگر میں ان سے نگاہ بچاکر کسی گمنام گوشہ میں ٹہلتا ہوا یا کسی دور اُفتادہ ٹیلہ کی آڑ میں بیٹھا ہوا، تنہائی کے لطف اٹھا رہا ہوتا ہوں تو یکایک میری پشت سے ایک یا چند قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں اور میں اس وقت اس طرح کانپ جاتا ہوں جیسے وہ لڑکا جو اسکول سے بھاگا ہوا ہو اور اس کو پکڑنے کے لئے اس کے ماسٹر ملک الموت بن کر اس کے سر پر نازل ہوگئے ہوں۔ میرا پتہ ان کو اس آسانی سے مل جاتا ہے کہ شروع شروع میں میں خود ان کی تلاش پر متعجب ہوتا تھا۔ لیکن اس کا بھی ایک سبب ہے ــــــ میں پردیس میں ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ ایک نئے شہر میں چند دن قیام کرنے کے بعد انسان ایک نئے تماشہ کے اشتہار کی طرح خود بخود مشہور ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی حرکات و سکنات سے اجنبیت ظاہر ہوتی ہو۔ چنانچہ میں جو کہ پردیس تو کیا خود اپنے دیس میں

بھی از سرتا پا اجنبی معلوم ہوتا ہوں لوگوں کی نگاہوں میں جلد کھٹک جاتا ہوں اور ایک خطرناک سیاسی مجرم کی طرح آئند و روند کے زیر مُطالعہ رہتا ہوں اور میرے دوست جو مجھ سے بے انتہا محبّت کرتے ہیں ـــــ "وہ جا رہے ہیں!" کی مدد سے مجھ تک پہونچ جاتے ہیں جب وہ مجھ کو پا لیتے ہیں تو معصوم بچوں کی طرح کِلکاریاں مار کر مجھ سے لپٹ جاتے ہیں اور اس وقت میں خود شرمندہ ہو جاتا ہوں اور اپنی سرد مہری پر افسوس کرنے لگتا ہوں۔ لیکن یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے دائمی نہیں۔

میں کبھی کبھی دفتر سے مقررہ اوقات سے قبل واپس آجاتا ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی صاحب میری ناک ہی میں رہتے ہیں اور مجھ کو فوراً آن دباتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی دخل اندازی مجھے ناگوار گزری ہے۔ اس لئے وہ اندر آنے سے قبل ایسی برجستہ تمہید اٹھاتے ہیں کہ میں مسکرا دیتا ہوں اور خود بخود یقین کرنے لگتا ہوں کہ مجھے ان کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً

"اوہو! آج کیسے چلے آئے۔" وہ جھجکتے ہوئے سوال کرتے ہیں۔

میں خاموش رہتا ہوں۔"

"دفتر اتنی جلد بند ہو گیا؟"۔

میں نفی میں گردن ہلا دیتا ہوں۔

"مزاج تو ٹھیک ہے؟"

میں سر کا اشارہ کر دیتا ہوں۔

"کچھ بات تو ضرور ہے۔ یہ اضمحلال بلا سبب نہیں ہو سکتا۔" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"نہیں صاحب!" میں تنگ آکر لب کشائی کرتا ہوں۔

"ایک بات کہوں آپ سے۔" بڑے رازدارانہ لہجے میں میرے قریب آکر کہتے ہیں۔

"فرمایئے۔" میں مجبوری کہتا ہوں۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر ڈالتے۔" وہ بزرگانہ شفقت سے فرماتے ہیں۔

"اوہ ـــــــ میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی نئی بات کہیں گے۔" میں ان کے اس بے محل سوال پر قہقہہ لگا کر کہتا ہوں۔

"آپ اس کو مذاق سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ کے اضمحلال کا یہی علاج ہے۔" وہ کہنہ مشق ڈاکٹر کی طرح کہتے ہیں۔

"تو میں کہاں مضمحل رہتا ہوں۔ آپ خود ہی دیکھتے ہیں روز۔" میں عاجز آکر کہتا ہوں۔

"ار بھئی میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آج آپ کی بڑی اچھی نسبت آئی ہے۔" وہ مسکرا کر کہتے ہیں۔

" کیسی نسبت ؟" میں مجسم سوال ہو کر پوچھتا ہوں۔

اور اس کے بعد وہ لڑکی کی خصوصیات پر ایک مورخ کی طرح تبصرہ کرنا شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ اس کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ جو میرے تخیلات کی ہم پلہ ہوتی ہے۔ اسی دوران میں مجھے خیال آتا ہے کہ وہ بہت دیر سے کھڑے ہی ہوئے تھے۔ مجھے اپنی اس بد دماغی پر ندامت ہوتی ہے۔ میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ آرام کرسی پر ان کو بٹھاتا ہوں نوکر کو چاء لانے کا حکم دیتا ہوں اور جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کرتا ہوں یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد ان کا وجود میرے لئے اٹل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس وقت وہ خود بھی جانا چاہیں تو بھی میں کہاں جانے دیتا ہوں۔

(عالمگیر سالنامہ ۱۹۳۷ء)

سیّد ابو طاہر صاحب نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام
حافظ محمد عالم صاحب پرنٹر چھپوا کر لوہٹہ سے شائع کیا۔